پاکستانی
ادب کے
معمار

اقبال ساجد: شخصیت اور فن

ڈاکٹر جواز جعفری

پاکستانی ادب کے معمار

اقبال ساجد
شخصیت اور فن

ڈاکٹر جواز جعفری

اکادمی ادبیات پاکستان

نگران اعلیٰ: فخر زمان

مہتمم: محمد عاصم بٹ

تدوین و مطبوعات: سعید درانی

اشاعت: 2010

تعداد: 500

اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد

مطبع: کلاسیک 042-37312977

قیمت: مجلد -/240روپے

غیر مجلد -/235روپے

ISBN: 978-969-472-250-4

Pakistani Adab Ke Mamar

" Iqbal Sajid : Shakhseyat our Fun"

Compiled By

Dr. Jawaz Jaffri

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ	فخر زمان	07
پیش لفظ	ڈاکٹر جواز جعفری	09
زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے		11
عہد جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟		49
اقبال ساجد ایک ناراض خو شاعر		135
منتخب کلام		143
ناقدین کی آراء		157
حوالہ جات وکتابیات		163

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی و ادبی کام اور اُن کی حیات کے بارے میں معلومات کو کتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔

ڈاکٹر جواز جعفری نے ''اردو ادب یورپ اور امریکہ میں'' اور ''اردو افسانے کا مغربی دریچہ'' جیسی کتابیں لکھ کر بیرونی دنیا میں مقیم اردو زبان کے اہلِ قلم کے تخلیقی کارناموں کو ادبی دنیا میں متعارف کرانے کے حوالے سے نہایت شاندار کام کیا ہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں دہائیوں جن شاعروں نے اردو غزل کو نیا رنگ و روپ عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ان میں اقبال ساجد ایک جانا پہچانا نام ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں اردو غزل جو بھی رنگ و روپ اختیار کرے گی اور جس بھی نہج پر اپنا سفر جاری رکھے گی اس کے زادِ سفر میں کچھ حصہ اقبال ساجد کا بھی ہوگا۔

اکادمی ادبیات پاکستان کی یہ کتاب اقبال ساجد کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہوگی اور امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے'' پاکستانی ادب کے معمار'' کے سلسلے کی اس کاوش کو پوری دُنیا میں تحسین کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

فخر زمان

پیش لفظ

اقبال ساجد جدید غزل کا معتبر شاعر ہے۔ایک ایسا غزل گو جس نے زبان و بیان موضوعات طرزِ احساس اور لہجے کی سطح پر غزل کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا۔اقبال ساجد کے فن اور شخصیت سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔اگر وہ میرا پسندیدہ شاعر نہیں ہے مگر اس کے تخلیقی سرمائے کو محفوظ بنانے ، بہت سے غیر جینوئن شاعروں سے "واگزار" کرانے اور کتابوں کی صورت میں قارئین تک پہچانے کے حوالے سے میں نے ہمیشہ کوشش کی ہیں۔آج سے بیس سال قبل میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر سہیل احمد خان کی نگرانی میں اقبال ساجد پر پہلا تحقیقی وتنقیدی مقالہ لکھا۔بعد ازاں "اثاثہ" اور "کلیاتِ اقبال ساجد" کی ترتیب وتدوین کے بعد انہیں جنگ پبلشرز لاہور سے شائع کرایا۔

اقبال ساجد کو ہم سے بچھڑے بیس سال ہو گئے ہیں مگر اس پورے عرصے میں شاید ہی کسی سنجیدہ نقاد نے اس کی غزل پر توجہ دی ہو۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان بیس برسوں میں اس کی غزل کے "خرید وفروخت" والے پہلو کو اتنا اچھالا گیا ہے کہ اس کی غزل پر کوئی سنجیدہ تنقیدی کاوش سامنے ہی نہیں آپائی۔گویا عملاً اس پر ہونے والی تنقید چند تفریحی کالموں تک محدود ہے۔"پیشہ ور" نقادوں سے کسی صلے کے بغیر تنقیدی مضمون لکھوانا قدرے مشکل کام ہے مگر اب وقت آگیا ہے ہمارے ناقدین کو اتنے خوبصورت شاعر کو نظر انداز کرنے کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔

ہم جانتے ہیں کہ زندہ تحریروں کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔میرے خیال میں ادیب کی تحریروں کو قیصوں کی طرح زندہ رہنا سیکھ لینا چاہیے ورنہ جو تحریریں اپنے خالق کے سہارے بغیر

پاؤں پر کھڑی نہیں ہوسکتیں وہ اپنے خالق کی موت کے ساتھ ہی بلکہ بعض صورتوں میں خالق سے پہلے مر جاتی ہیں۔ اقبال ساجد کی شاعری نے تیموں کی طرح زندہ رہنا سیکھ لیا ہے اور پچھلے بیس سالوں میں یہ شاعری پوری طرح اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی ہے۔ اقبال ساجد کے راستے کی رکاوٹوں میں اس کے چند دوست نما دشمن اور اُس کی اپنی فیملی کے لوگ شامل ہیں جس کے غیر دوستانہ رویوں کے باعث اقبال ساجد کی شاعری پچھلے طویل عرصے سے مارکیٹ سے غائب ہے۔ یہ کتاب (جو آپ کے ہاتھوں میں ہے) بڑی حد تک اس کمی کو بھی پورا کرے گی کہ اس میں ساجد کی غزلوں کا اچھا خاصا انتخاب شامل ہے۔

یہ کتاب مجھ سے بارہ تیرہ سال قبل اکادمی ادبیات پاکستان نے لکھوائی تھی مگر گذشتہ بارہ سالوں میں جو لوگ اس قومی ادارے کے سیاہ وسفید کے مالک رہے ان کے ''ذاتی ایجنڈے'' کی بھینٹ چڑھنے کے بعد یہ کتاب ''طاقِ التوا'' پر رکھ دی گئی۔ مقامِ شکر ہے کہ میرے ہمدم دیرینہ اور اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین جناب فخر زمان (جو اردو اور پنجابی زبان کے ممتاز ادیب ہیں) کی ذاتی توجہ کے نتیجے میں یہ کتاب طویل انتظار کے بعد منظر عام پر آرہی ہے اور اس پیشکش میں سعیدہ درانی جی کی کاوشیں بھی لائقِ تحسین ہیں۔ امید ہے یہ کتاب اقبال ساجد کے فن اور شخصیت کی تفہیم میں مزید آسانیاں اور سہولتیں فراہم کرے گی۔

ڈاکٹر جواز جعفری

حالات زندگی

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے

کسی بھی تخلیق کار کی شخصی زندگی پر قلم اٹھانا یقیناً ایک مشکل کام ہے کیونکہ فن کار کی زندگی عام آدمی سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ اس کی بظاہر مرتب زندگی میں ایک خاص طرح کی بے ترتیبی اور نارمل شخصیت کے اندر ایک عجیب قسم کی ابنارملٹی نظر آتی ہے۔ تنقید کا ایک سکول آف تھاٹ تو اس ابنارملٹی کو تخلیق کار کی شخصیت کے لیے ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ یہی ابنارملٹی اسے تخلیقی اور فنی سطح پر متحرک رکھتی ہے اور اس کے نتیجے میں فن کار اپنے اردگرد پھیلی بے ترتیبی میں توازن اور حسن تلاش کرتا ہے اور یہی توازن ایک صحت منداور مستحکم معاشرے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

فن کار کی جسمانی موت کے بعد اس کی زندگی کے بارے میں حقائق و واقعات کو اکھٹا کر کے انہیں اس طرح ترتیب دینا کہ وہ سب کے لیے قابل قبول بن جائیں۔ یقیناً ایک مشکل اور نازک کام ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارا تخلیق کار تخلیقی سطح پر ایک Organized Life بسر کرنے کے باوجود سماجی اعتبار سے اکثر و بیشتر ایک منتشر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس لیے بیشتر اہل قلم اپنی فنی اور نجی زندگی کے بارے میں باقاعدہ ریکارڈ نہیں رکھتے۔ حتیٰ کہ بہت سے لکھنے والے تو زندگی میں اپنا کلام بھی ایک جگہ جمع کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے اور عملاً یہ کام آنے والے ریسرچ سکالر پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جس سے تحقیق کے طالب علم کو بہت سی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر اقبال ساجد جیسے بے ترتیب، غیر محتاط، لاپرواہ اور بے ہوش فنکار کے بارے میں تو یہ بات سو فیصد صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اقبال ساجد نے کسی تعلیمی ادارے میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور نہ ہی کسی سرکاری وغیر سرکاری انسٹیٹیوٹ میں سروس اختیار کی کہ جہاں سے تحقیق کا طالب علم اُس کے تعلیمی کوائف معلوم کر سکے۔ علاوہ ازیں اُس کے اہل خانہ کے پاس بھی اس قسم کے ڈاکومنٹس (دستاویزات) دستیاب نہیں ہیں کہ جن کے ذریعے اقبال ساجد (مرحوم) کی تعلیمی قابلیت اور دیگر کوائف کا اندازہ لگایا جا سکے۔ لہٰذا اس کتاب میں جو باتیں لکھی جائیں گی ان کے حصول کا ذریعہ مرحوم کی بیگم اور اُس کے قابل اعتماد دوست واحباب ہی ہیں۔ مستند ذرائع کی عدم موجودگی میں اقبال ساجد کی شخصی زندگی پر قلم اٹھانا تحقیق کے طالب علم کے لیے ایک مشکل کام ہے جو یقیناً تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔

اقبال ساجد ۱۹۳۹ء میں لنڈھورا ضلع سہارنپور یو۔پی (انڈیا) میں پیدا ہوا (1)۔ انکی صحیح تاریخ پیدائش تقسیم کے وقت ہونے والے ہنگاموں کی نذر ہوگئی۔ ساجد کا تعلق شیخ قریشی قبیلے سے تھا اور اُس کے والد کا نام غلام محمد تھا جو برطانوی ہند کی فوج میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا انتقال دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر ایک ہوائی سفر کے دوران حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث ہوا۔ اس حادثے کے حوالے سے بیگم اقبال ساجد (اصلی نام خورشید بیگم) کا کہنا ہے کہ برطانوی حکومت نے مرحوم کی اعلیٰ فوجی خدمات کے صلے میں انہیں فوجی اعزاز دینے کا اعلان کیا تھا جسے وصول کرنے وہ بذریعہ ہوائی جہاز جا رہے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے مرحوم اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور وہ سنگاپور میں دفن ہوئے۔(2)

والد کے انتقال کے وقت ساجد کی عمر پانچ یا سات برس تھی۔ غلام محمد کے کُل چار بچے ایک بیٹا (اقبال ساجد) اور تین بیٹیاں (اقبال النساء، نفیسہ اور خیر النساء جو تا حال زندہ ہیں) تھیں۔ ان کی وفات سے قبل یہ مختصر سا گھرانہ خوشحالی اور آسودگی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ بچوں کی پرورش بڑے ناز و نعم کے ساتھ ہو رہی تھی کہ سربراہِ خاندان کی اچانک موت کے نتیجے میں ہنستا بستا گھرانہ کئی طرح کی سماجی، نفسیاتی اور معاشی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ یہیں سے اقبال ساجد کے

المیے کی ابتدا ہوتی ہے۔

غلام محمد کی وفات کے بعد ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری مرحوم کی بڑی بہن اور بہنوئی (جن کا نام محمد رفیق تھا) نے قبول کی۔ بیگم ساجد کے بقول اس غیر متوقع حادثے کے نتیجے میں اقبال ساجد کی ماں (جن کا نام محبوبہ تھا) کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بیوگی میں بڑے مسائل اور صدمے برداشت کیے۔ ان کا انتقال تقسیم ہند کے بعد جنوری ۱۹۷۵ء کو لاہور میں ہوا۔ اگر چہ ساجد کے پھوپھا اور پھوپھی پر بیک وقت دو خاندانوں کا بوجھ آن پڑا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اقبال ساجد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے اسے قصبہ شیر کوٹ ضلع بجنور (یو۔پی) کے اسکول میں داخل کرایا جہاں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں مسلمانانِ ہند کی تحریک آزادی پورے عروج پر تھی جس کے نتیجے میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو بالآخر پاکستان کے نام سے ایک نیا ملک دنیا کے نقشے پر معرض وجود میں آیا۔ لہٰذا اقبال ساجد ہجرت کے عظیم ریلے میں اپنے آبائی قصبے کو الوداع کہہ کر بیوہ ماں کی انگلی پکڑے پاکستان چلا آیا۔ تحریک آزادی کے وقت ساجد لڑکپن کی منزل سے گزر رہا تھا۔ اس وقت کی پوری ہندوستانی زندگی انسانی حقوق اور آزادیوں کے خلاف بڑھتی ہوئی انگریزی استعمار کی ظالمانہ کاروائیوں کے خلاف سراپائے احتجاج بنی ہوئی تھی۔ اقبال ساجد کی شخصیت کا خمیر اسی اجتماعی احتجاج کی لے سے اٹھا تھا بعد ازاں اسی احتجاجی کلچر نے اس کی شاعری کو خام مال اور پس منظر مہیا کیا۔

قیام پاکستان کے بعد ساجد کی ایک بہن (نفیسہ) اپنی پھوپھی کے پاس بھارت ہی میں رہ گئی جب کہ باقی دو بہنیں ماں اور بھائی کے ساتھ پاکستان چلی آئیں۔ یوں ساجد کا چھوٹا سا خاندان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس تقسیم پر ساجد بہت دل گرفتہ تھا کیونکہ تقسیم ہند محض جغرافیائی تقسیم نہ تھی بلکہ اس کے نتیجے میں ایک ہزار سالہ ہندو مسلم ثقافت، دھرتی، فصلیں، موسم، پرندے، کلچرل اثاثے، روایات، رشتے ناتے اور محبت سب کچھ تقسیم ہو کر رہ گیا۔

لاہور آ کر یہ لٹا پٹا خاندان احاطہ دتو شاہ (موجودہ نام آسٹریلیا چوک) کے ایک نہایت خستہ اور تنگ و تاریک مکان میں رہنے لگا۔ بیگم اقبال ساجد کے بقول اقبال ساجد شادی سے قبل کچھ عرصے کے لیے کراچی چلا گیا تھا وہاں اس نے محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ میٹرک کا امتحان بھی پاس کیا۔(3)۔ ساجد کے میٹرک پاس کرنے کا کوئی دستاویزی ثبوت دموجود نہیں البتہ اس نے ہر جگہ خود کو میٹرک ہی لکھا ہے۔ ان کے مطابق ''کراچی میں اقبال ساجد کے استاد رہتے تھے (4) جو بہت اچھے شاعر تھے ساجد انہیں کے ہاں رہتے تھے۔ یہ استاد ہماری شادی کے بعد بھی کئی بار ملنے لاہور آئے مگر اب ان کا انتقال ہو گیا ہے۔''

قیام پاکستان کے بعد اقبال ساجد کی بیشتر زندگی کراچی اور لاہور میں بسر ہوئی۔ کراچی سے واپسی پر جب شادی ہو گئی تو ساجد لاہور ہی کا ہو کر رہ گیا۔

۱۹۷۹ء میں اقبال ساجد ہجرت کے بعد پہلی بار ہندوستان گیا اس سفر میں اس کے اہلِ خانہ بھی ہمراہ تھے۔ اس یاترا کے نتیجے میں وہاں اس کی بڑی قدر ہوئی۔ انبالہ، دہلی اور دیگر شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں اس کی شعری آواز کو بڑی محبت سے سنا گیا اور لوگوں نے اس کی شاعری کی خوشبو کو پہلی بار قریب سے محسوس کیا اور انہیں عالمی مشاعروں میں شریک ہونے والے پاکستانی ادبی مافیا کے نیم شعراء کے کچے پکے شعروں کے برعکس اقبال ساجد کی شاعری میں ایک نیا ذائقہ محسوس ہوا۔ جس میں پاکستانی مٹی کی خوشبو کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگوں کے دکھ سکھ سانس لیتے ہوئے محسوس ہوئے۔

مراد آباد کے لوگوں کے بے حد اصرار کے باوجود ساجد ناسازئ طبیعت کے باعث مشاعرے میں شریک نہ ہو سکا۔ دہلی کے مشاعرے میں اس کی ملاقات پاکستان کی ایک معروف شاعرہ سے ہوئی جو ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران بعض سیاسی وجوہ کی بناء پر ہندوستان میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ شاعرہ نے ساجد کو وطن واپس جانے کی بجائے ہندوستان میں قیام کرنا کا مشورہ دیا مگر جواباً ساجد ناراض ہو کر کہنے لگا ''تم مشکل وقت میں وطن کو تنہا چھوڑ آئی ہو جبکہ میں

ان حالات میں وطن سے دور نہیں رہ سکتا۔"(5)

اس سفر کے دوران مرحوم نے تقریباً پانچ ماہ تک انڈیا میں قیام کیا۔ ۱۹۸۶ء میں وہ دوبارہ بھارت گیا اور بمبئی کے مشاعروں میں شرکت کی اس وقت تک وہ پاکستان میں نئی غزل کے اہم ترین شعراء میں شمار ہونے لگا تھا۔

۱۹۷۰ء میں اقبال ساجد کی شادی اس کی ماموں زاد خورشید بیگم سے ہوئی۔ شادی کے وقت ساجد شعر کہنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں اور خاندان کے دیگر بزرگوں کا خیال تھا کے شادی کے بعد گھریلو ذمہ داریوں کے پیش نظر وہ کام کرنے لگے گا مگر خلاف توقع اس نے کبھی بھی سماجی اور معاشی ذمہ داری کو پوری طرح قبول نہیں کیا اور گھر کی مالی حالت جو پہلے ہی بہت خستہ تھی۔ خراب سے خراب تر ہونے لگی۔ بیگم ساجد کے بقول

"شادی کے وقت وہ صرف شعر کہا کرتے تھے۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ اس کے علاوہ میں نے انہیں زندگی میں کوئی اور کام کرتے نہیں دیکھا۔ شادی کے بعد میں اکثر انہیں کام کرنے کے لیے کہتی تو وہ جواباً کہا کرتے "میں شاعری کے ذریعے ایک دن اتنا امیر ہو جاؤں گا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔ تم دیکھنا میری کتابیں لاکھوں میں فروخت ہونگی"

مگر قلم کے ذریعے ایک باعزت اور خوشحال زندگی بسر کرنے کا اس کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور سچ تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں اس نے خود بھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ شاید اس سلسلے میں اس کے سامنے امریکہ اور یورپ کے اہل قلم کی مثالیں تھیں جہاں مصنف کی اگر ایک بھی کتاب Hit ہو جائے تو آنے والی کئی نسلیں روزگار کے مسئلے سے آزاد ہو جاتی ہیں۔ اس کی بہت سی وجوہات میں سے پہلی یہ ہے کہ وہاں شرح خواندگی سو فیصد ہے اور معمولی معمولی کتابوں کا پہلا ایڈیشن بھی لاکھوں کی تعداد میں چھپتا ہے جس کا سبب لوگوں میں مطالعے کا بے پناہ شوق ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں شرح خواندگی شرمناک حد تک کم ہے اور بڑی سے بڑی کتاب کا ایڈیشن ہزار

سے زیادہ نہیں چھپتا۔ بلکہ اب تو ایک ایک سو کے ایڈیشن بھی بازار میں دستیاب ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ پانچ سو کتاب اب پانچ ایڈیشنز کی صورت میں منظر عام پر آتی ہے۔ اس طریقے سے شاعر یہ تاثر پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے کہ اس کی کتاب Best Seller ہے اور اس کے دھڑا دھڑ ایڈیشن مارکیٹ میں آرہے ہیں جو ہمارے نزدیک قاری کو دھوکہ دینے سے زیادہ خود شاعر کے لیے خود فریبی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ علاوہ ازیں پاپولیرٹی کے خبط میں مبتلا بیشتر شعراء نے بھی عوامی ذوق کی تربیت اور اُسے بلند کرنے کی بجائے اُلٹا عوامی ذوق کو اپنے لیے ''راہنما'' بنالیا ہے۔ بعض ''مقبول'' شعراء نے تو شعری مجموعوں کے اندر مشکل الفاظ کے معانی بھی درج کرنے شروع کر دیے ہیں امید ہے کہ وہ بہت جلد شعری مجموعوں میں اشعار کے ساتھ ساتھ ان کی تشریح کا بندوبست کر کے قاری کے ذوق مطالعہ پر عدم اعتماد کرتے ہوئے اسے ذہنی طور پر مزید اپاہج بنانے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ ان شعراء نے ذہنی بلوغت کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہی نہ صرف اپنے کلیات شائع کر دیے ہیں بلکہ اپنے تنخواہ خوار'' نقادوں'' سے اپنے فن و شخصیات پر کتابیں بھی لکھوا ڈالی ہیں۔ یہ سب خبط عظمت کے علاوہ کیا ہے؟ اہل تخلیق کی انہی غیر تخلیقی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہر طرف ایک Anty Creation فضا وجود میں آ گئی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ''مقبول'' شعراء اور حریص پبلشرز کی ملی بھگت نے اچھے اور معیاری ادب کی پیشکش کو تقریباً ناممکن بنا دیا ہے۔ اور اب صورتحال یہ ہے کہ ادب کا پریشاں نظر قاری بعض نوجوان اور مقبول شعراء کی کتابوں کے ''کتب مینار'' سے کود کر فکری خودکشی کا ارادہ باندھ رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں سچے تخلیق کار پسپا ہوتے ہوتے گوشہ نشینی کی منزل تک جا پہنچے ہیں اور مقبول شعراء کو ہر طرف کھلا میدان میسر آ گیا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے زر پرست معاشرے میں بیشتر ''اہل قلم'' کی طرف سے پیدا کردہ اس غیر تخلیقی ماحول میں اقبال ساجد جیسا خالص شاعر بھلا قلم کے زور پر کیسے اور کب تک زندہ رہ سکتا ہے؟

اقبال ساجد کے خاندان کے زیادہ تر لوگ سنگتراشی کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ لہٰذا اس نے بھی

اپنے ایک عزیز کے ہاں (جن کا سنگتراشی کا کاروبار تھا) ملازمت کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی لاابالی طبیعت کے ہاتھوں اسے جاری نہ رکھ سکا۔ وہ خود کہتا ہے

اک طبیعت تھی سو وہ لا اُبالی ہو گئی
ہائے یہ تصویر بھی رنگوں سے خالی ہوگئی

اقبال ساجد نے ایک جگہ لکھا (6) ہے کہ وہ گزراوقات کے لیے ایک عرصے تک مختلف چیزیں فروخت کرتا رہا ہے۔ جس کی شہادت اس کے کلام سے بھی ملتی ہے۔

کیا ملا اقبال ساجد ندرتِ فن بیچ کر
اب گزراوقات کرداتنوں کا منجن بیچ کر

اردو ادب میں محنت کی عظمت کے حوالے سے سب سے مناسب مثال احسان دانش تو رہا ہے سپرا کی ہے مگر اقبال ساجد تو محض شعر پر محنت کرنے کے علاوہ کسی قسم کی محنت میں یقین نہیں رکھتا تھا۔ ساجد نے اگرچہ زندگی کا تھوڑا بہت ساتھ دینے کی کوشش کی مگر درحقیقت وہ اول و آخر ایک شاعر تھا۔ ایک ایسا شاعر جو شعر کہنے کے علاوہ کسی قسم کی سماجی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر تھا۔ وہ کہتا ہے

لوگوں نے زر کے واسطے کیا کچھ نہیں کیا
اور ہم نے شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا

اقبال ساجد صرف شاعر تھا، وہ ایک ایسا ادبی کسان تھا جس نے بڑی بڑی بنجر اور ویران زمینوں کو شادابی اور زرخیزی بخشی۔ وہ لفظ کاشت کرتا تھا اور اپنے خونِ دل سے اس کی آبیاری کرتا تھا۔ اس کے کاشت کیے ہوئے لفظوں سے آج اس کی غزل کا باغیچہ مہک رہا ہے۔

سرُخ لہو سے یہ پھلواڑی کرتا ہوں
میں لفظوں کی کھیتی باڑی کرتا ہوں

ساجد کی ذات کے اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے منو بھائی نے لکھا ہے۔

''میرے خیال میں اگر کوئی غریب شخص ''فل ٹائم'' سیاست یا خالص سیاست نہیں
کر سکتا تو کوئی غریب فل ٹائم شاعری یا خالص شاعری بھی نہیں کر سکتا۔ محض ادب
اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ اس ادب کے ساتھ اسے ادبی گروہ بند میں بھی شریک ہونا
پڑے گا۔ یا کوئی سرکاری، غیر سرکاری نوکری کرنا پڑے گی۔ دوبئی اور کویت کے
شاعروں کا ایجنٹ بھی بننا پڑے گا۔ محض شاعری یا خالص شاعری یا فل ٹائم شاعری
اقبال ساجد کو جن راستوں پر لے گئی وہاں سے بچ نکلنے کے لیے حبیب جالب کی سی
نظریاتی پختگی اور درد مندوں کا وسیع حلقہ چاہیے جو گرتوں کو تھام سکے''

جہاں تک درد مندوں کا تعلق ہے اس کی تو اقبال ساجد کو بھی کمی نہیں تھی مگر نظریاتی پختگی کے حوالے سے واقعی اس کا دامن خالی تھا کیونکہ وہ دائیں یا بائیں بازو کی کسی جماعت کا رکن نہیں تھا اس کی وابستگی صرف اپنے شعر سے تھی۔

بات صرف یہیں تک رہتی تو شاید زیادہ خطرناک نہیں تھی لیکن ساجد کے اس المیاتی افسانے میں کلائمکس اُس وقت آیا جب اس نے ایک دن چپکے سے شراب نوشی بھی شروع کر دی۔ دوستوں کے بقول ۱۹۷۵ء کے آس پاس اُس کی مے نوشی کا آغاز ہوا۔

مسز ساجد کے بقول:

وہ اکثر راتوں کو دیر سے گھر آنے لگتے تھے۔ میں رات گئے تک بھوکی پیاسی کھانے پر ان کا انتظار کیا کرتی۔ کئی مرتبہ اس بات پر ہمارا جھگڑا بھی ہوا۔ آخر انہوں نے کہہ دیا کہ میں شعر و شاعری کی محفلوں میں لیٹ ہو جاتا ہوں لہٰذا تم انتظار مت کیا کرو۔ تب میں نے دل کو سمجھا لیا لیکن وہ دن بدن گھر اور بچوں کی طرف سے بھی لاپروائی برتنے لگے۔ راتوں کو دیر سے گھر آنا، اور راتوں کو گھر سے باہر رہنا اُن کا معمول بن گیا۔ اسی زمانے میں ایک رات جب وہ دیر سے گھر لوٹے تو ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بہکی بہکی باتوں کے ساتھ ساتھ منہ سے بدبو بھی آ رہی تھی۔ میری ساس

جو ایک جہاں دیدہ عورت تھیں، وہ سمجھ گئیں اور ساجد کو خوب بُرا بھلا کہا۔ ماں کی
ناراضی کو دیکھ کر انہوں نے معافی مانگی اور آئندہ شراب نہ پینے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس
کے باوجود وہ اکثر رات کو نشے کی حالت میں گھر لوٹتے۔ شروع میں، میں اور میری
ساس نے بہت احتجاج کیا۔ گھر میں جھگڑے بھی ہوئے لیکن ان کے کانوں پر جُوں
تک نہ رینگتی بلکہ دن بدن ان کی شراب نوشی میں شدت آنے لگی اور آخر تنگ آ کر ہم
نے اس موضوع پر بات کرنا چھوڑ دی'' (7)

جب میری طرف سے احتجاج اور لعنت وملامت ختم ہو گئی تو ساجد پوری آزادی کے
ساتھ شراب پینے لگا۔ اب تو وہ شراب کی بوتل بلا روک ٹوک گھر بھی لے آتا اور
بچوں کے درمیان بیٹھ کر پیتا۔ بچے اگر منع کرتے تو کہتا ''شراب پینا تو غالبؔ کا
شیوہ ہے'' بچے ہنستے اور کہتے ''ابو آپ تو واقعی غالبؔ بنتے جا رہے ہیں'' (8)

ساجد کو اپنی بڑی بیٹی خوشنما سے بڑی محبت تھی، جس کی شادی ۱۹۸۸ء میں مرحوم کی زندگی ہی
میں اپنی پھوپھی نفیسہ کے ہاں انڈیا میں ہو گئی تھی، وہ اسے اکثر سمجھایا کرتی مگر وہ سمجھنے سمجھانے کی
حدوں سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ ہاں البتہ خوشنما کی شادی کے دنوں میں اُس نے بیٹی کے کہنے
پر پورے تین ماہ تک شراب کو منہ نہیں لگایا لیکن جیسے ہی بیٹی کی ڈولی رخصت ہوئی اس نے توبہ توڑ
دی اور ایک بار پھر شراب کے نشے میں غرق ہو گیا۔

بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ شروع میں اقبال ساجد شراب سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس سلسلے
میں مرحوم کی بیوہ نے ایک واقعہ سنایا کہ

''ہمارے پڑوس میں ایک شخص رہا کرتا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شراب
نوشی کرتا ہے۔ ایک دن اتفاق سے قریب سے گزرتے ہوئے اس کا ہاتھ ساجد کے
ہاتھ سے چھو گیا۔ اس کے بعد ساجد دیر تک رگڑ رگڑ کر ہاتھ صاف کرتے رہے۔
ساجد کی ماں پان کھانے کی عادی تھیں ایک دن وہ اُسی ہمسائے کے گھر سے پان

لے آئیں۔ ساجد کو پتہ چلا تو انہوں نے ماں کے ہاتھ سے پان چھین کر دور پھینکتے ہوئے کہا "شرابی کے گھر کا پان کھاؤ گی؟" (9)

اسی طرح پاک ٹی ہاؤس کے منیجر زاہد سراج کا کہنا ہے کہ ۱۹۶۸ء کے قریب ساجد دوستوں کو شراب نوشی سے منع کیا کرتا تھا۔ منو بھائی نے لکھا ہے کہ

"مجھے بھی یاد ہے اور پاک ٹی ہاؤس کے دوستوں کو بھی یاد ہوگا کہ اٹھارہ انیس سال پہلے اقبال ساجد شغلِ مے نوشی پر مائل دوستوں کے ہاتھوں سے گلاس لے کر توڑ دیا کرتا تھا اُس کی مشاعروں کی کمائی میں سے اگر کوئی "ریگل بار" کا ضرورت مند دس روپے مانگتا تو کہتا "مٹھائی کھانی ہے تو دے دونگا اس کام کے لیے ایک روپیہ نہیں دونگا، میرے پیسوں سے تم زہر نہیں کھا سکتے۔" دوستوں نے تو اُس سے یہ بھی سنا ہے کہ یہ روپے تم اپنے بچوں کے لئے پھل خریدنے پر صرف کیوں نہیں کرتے؟ کبھی خود کو نشے کی حالت میں دیکھو تو پتہ چلے کہ یہ کتنی بُری شئے ہے، تمہارے محلے کے نوجوان اور بچے جب تمہیں اس حالت میں دیکھتے ہونگے تو کیا سوچتے ہونگے؟"

اور یہ کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ اقبال ساجد اپنے گھر کے دروازے کے سامنے مر رہا تھا اور گلی محلے کے بچے اسے کسی اور حالت میں مجھ رہے تھے اور اسے پتھر اور گیلیاں مار رہے تھے۔ ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کی فرصت ہی نہیں کہ اٹھارہ انیس سال پہلے والے اقبال ساجد اور اپنے فلیٹ کے دروازے پر دم توڑنے والے اقبال ساجد کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اور اِس تعلق کے بگاڑ کی کیا وجوہات ہیں اور ان وجوہات کا ذمہ دار کون ہے؟" (10)

جہاں تک اقبال ساجد کی مے نوشی کی وجوہات تلاش کرنے کا تعلق ہے تو اِس سلسلے میں بے شمار افسانے مشہور ہیں۔

لاہور میں مقیم ایک نوجوان شاعر کے بقول

''اقبال ساجد کو شراب نوشی کی ذلتوں میں گرانے والا شخص خود بھی شاعر ہے اور لاہور ہی میں مقیم ہے۔ جس زمانے میں آوازوں کے ہجوم میں اقبال ساجد نے اپنی الگ اور منفرد آواز میں غزل گوئی شروع کی تو اس کے سامنے بڑے بڑوں کے چراغ گل ہونے لگے تھے۔ چنانچہ یہ شاعر، ساجد کی دلفریب، تازہ اور منفرد آواز کے سحر سے خوفزدہ ہو گیا اور اسے اپنی شہرت کا محل متزلزل نظر آنے لگا چنانچہ اُس نے ساجد کو شراب نوشی کی لت ڈال دی اور کہا کہ'' تم جتنی شراب نوشی کرو گے اتنے ہی بڑے شاعر بنو گے۔'' وہ شاعر جانتا تھا کہ ساجد ایک غریب اور بے روزگار آدمی ہے لہٰذا شراب نوشی زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھ سکے گا اور اپنی ہی آگ میں جل جل کر خود بخود مر جائے گا۔(11)

مذکورہ شاعر نے یہ باتیں اُس انٹرویو کے دوران کہی تھیں جو میں نے اپنے تحقیقی مقالے (اقبال ساجد فن اور شخصیت) کے لیے ریکارڈ کیا تھا۔ یہ تھیسز میں نے ایم۔اے اردو کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے لیے ڈاکٹر سہیل احمد خان مرحوم کی نگرانی میں قلم بند کیا تھا۔

اقبال ساجد کی شراب نوشی کے محرکات پر گفتگو کرتے ہوئے بیگم اقبال ساجد نے بتایا کہ

'' اکثر شعراء ساجد کے فنی مرتبے سے حسد کرتے تھے۔ اگر ٹی ہاؤس میں اقبال ساجد کا دعوت نامہ اُن کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اسے پھاڑ دیتے تاکہ ساجد اُس مشاعرے میں نہ جا سکے۔ کیونکہ جہاں ساجد ہوتا تھا وہاں بڑے بڑے شاعر فلاپ ہو جایا کرتے تھے۔ جن دنوں ہم آسڑیلیا چوک میں رہا کرتے تھے ان دنوں ساجد نے نئی نئی شراب پینا شروع کی تھی۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک شخص ساجد کو سہارا دیے ہمارے گھر کی طرف آرہا ہے۔ ساجد ہوش میں نہیں تھے

اور اُن کے قدم لڑکھڑا رہے تھے یہ شخص کافی خوبصورت تھا اور اُس نے اپنے بال اوپر کو سنوارے ہوئے تھے اُسکی رنگت سفید اور ناک ستواں تھی۔ بعد ازاں مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک مشہور شاعر ہے اُس زمانے میں اُس کا بڑا زور تھا۔ اس کے بعد وہ شاعر اکثر ساجد کو آکر گھر سے لے جاتا اور جب رات گئے انہیں چھوڑنے آتا تو ساجد نشے میں دُھت ہوتے تھے۔ جب محلے والوں کو اس بات کا پتہ چلا تو سب لوگ اُس شاعر پر سخت برہم ہوئے۔ یہاں تک کہ میں نے اُس شاعر کو ساجد کی موت کے موقع پر بھی نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ ساجد کو شراب نوشی کی عادت اسی شاعر نے ڈالی" (12)

خیر یہ تو محض تصویر کا ایک رُخ ہے اگر غور کیا جائے تو ہر وہ شخص اقبال ساجد کے بچوں کا مُجرم ہے جس نے ایک روپیہ بھی اسے شراب پینے کے لیے فراہم کیا۔ اس جُرم میں وہ استحصالی شاعر بھی شامل ہیں جو چند روپوں یا شراب کی کُپی کے عوض اُس کی غزلوں کا نیلام کرتے رہے۔ انہی کرم فرماؤں کے ادبی ہتھکنڈوں اور سماجی زندگی کے سنگین حقائق سے فرار کے سبب ساجد دن بدن شراب نوشی کی دلدل میں اترتا چلا گیا۔ وہ لوگ جن کے ساتھ مل کر اُس نے شراب نوشی کی ابتداء کی تھی آخر کب تک اس کا ساتھ دیتے؟ سب ایک ایک کر کے ہوا ہو گئے۔ اب ساجد کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آخر اِس شغل مے نوشی کو کیونکر جاری رکھا جائے؟ چنانچہ اُس نے اونے پونے اپنے خونِ جگر سے تخلیق کی ہوئی غزلیں بیچنی شروع کر دیں۔

غزلیں تو وہ شروع ہی سے بیچا کرتا تھا مگر اب اس میں شدت آ گئی تھی۔ خریدنے والوں میں صرف کالج اور یونیورسٹیوں کے لڑکے اور لڑکیاں ہی شامل نہیں تھیں بلکہ سچ پوچھیے تو ان میں موجودہ عہد کے بعض ایسے شاعر اور شاعرات کے نام بھی آئے ہیں جو سماجی اعتبار سے بڑے بڑے منفعت بخش عہدوں پر فائز ہیں اور جن کی شہرت کے تاج محل ساجد کی مُردہ ہڈیوں پر کھڑے ہیں۔ مسز اقبال ساجد نے اس کی کلام فروشی کی عادت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا۔

"ساجد گھریلو ضروریات اور اپنے نشے کو پورا کرنے کے لئے اکثر و بیشتر اپنی خوبصورت غزلیں سستے داموں فروخت کر دیا کرتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ آتے ان کی جیب میں چند سکّے یا شراب کی ایک گھی ڈالتے اور ان سے کئی کئی غزلیں لکھوا کر لے جاتے۔ ان کے باعث آج کے بہت سے شاعر صاحب کتاب ہو گئے۔ یہ لوگ ساجد سے بیس پچیس روپے میں غزل لے جاتے تھے۔ وہ ایماندار انسان تھے جو غزلیں فروخت کرتے وہ بالکل تازہ ہوتی تھیں اور وہ انہیں دوبارہ اپنے دیوان میں شامل نہیں کرتے تھے۔ ان کے کلام کے خریداروں میں نوجوان طالب علموں کے علاوہ ریڈیو پاکستان کے ایک بڑے افسر بھی شامل تھے جن کا اب انتقال ہو چکا ہے۔--------------------- ساجد سے غزلیں خرید کر خود کو شاعر کہلوانے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اور اس قطار میں نہ صرف آج کے عہد کے بڑے بڑے نامور شاعر کھڑے ہیں بلکہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ جن دنوں ساجد گلاب دیوی ہسپتال میں داخل تھے انہی دنوں وہاں ایک شاعرہ آیا کرتی تھی یہ شاعرہ ان دنوں ایک تعلیمی ادارے میں پروفیسر ہے اور شاعری میں اس کا کافی نام ہے۔ وہ چپکے سے آتی، ساجد کا حال احوال پوچھتی، اُن سے کچھ کاغذات وصول کرتی اور واپس چلی جاتی۔ میرے پوچھنے پر ایک دن انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ عورت مجھ سے غزلیں خریدنے آتی ہے۔ (13)

اقبال ساجد اس سلسلے میں خود بھی کسی قسم کی راز داری کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ بلکہ ادھر غزل فروخت کی ادھر سب کو بتا بھی دیا کہ "فلاں شاعر مجھ سے غزل خرید کر لے گیا ہے۔" وہ اکثر مشاعروں میں نشے کی حالت میں اپنی شاعری کے خریداروں کا پول کھول دیتا۔ اکثر بازار میں نئی آنے والی کتابوں کے بارے میں کہتا کہ "یہ کتاب دراصل میری ہے۔"

جن دنوں میں ڈاکٹر سہیل احمد خان کی نگرانی میں اقبال ساجد کے فن اور شخصیت پر تحقیقی مقالا لکھ

رہا تھا۔ مجھے کئی بار بیگم اقبال ساجد اور ان کے بچوں سے ملنے کے مواقع ملے۔ انہی دنوں بیگم ساجد نے مجھے ساجد کے اپنے ہاتھوں کے لکھے کئی بیاض دکھائے (جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں) جن کے مطالعے کے دوران بے شمار ایسی غزلیں سامنے آئیں جو اِن دنوں بعض ممتاز شعراء اور شاعرات کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ ساجد نے ایسی تمام غزلیں فروخت کردینے کے باوجود انہیں اپنی بیاض میں شامل کیے رکھا۔ اگر آپ ساجد کی کسی بیاض کا مطالعہ کریں تو اس کی غزلوں کے درمیان اچانک ہی کوئی ایسی غزل سامنے آجائے گی جس کے دائیں کونے پر تو حسب معمول اقبال ساجد ہی کا نام نظر آئے گا مگر بائیں کونے پر ایک اضافی سطر ملے گی جس پر لکھا ہوگا ''فلاں صاحب یا صاحبہ کے لیے۔ (بیاض میں فلاں کی جگہ خریدار کا نام لکھا ہے) مزے کی بات یہ ہے کہ خریداروں کی فرمائش پر کہی گئی غزلوں کے مقطعوں میں ہر خریدار کا تخلص بھی استعمال کیا گیا ہے البتہ بعض غزلیں خریدار کے تخلص کے بغیر بھی ہیں مگر صفحے کے بائیں کونے پر خریدار کا نام لکھنا اقبال ساجد کبھی نہیں بھولتا۔

نمونے کے طور پر اس قسم کی چند غزلیں ساجد کا پہلا مجموعہ ''اثاثہ'' مرتب کرتے وقت میں نے کتاب میں شامل کردی تھیں اور بعد ازاں ۱۹۹۳ء میں جب میں نے اس کی کلیات جنگ پبلشرز کے زیر اہتمام شائع کی تو اس کے اندر بھی ایسی بے شمار غزلیں (بکی ہوئی) شامل تھیں۔ وہ بھی جن میں خریدار کا تخلص شامل ہے اور وہ بھی جو تخلص کے بغیر ہیں میں نے محض یہ سوچ کر ان غزلوں کو ساجد کے کلیات میں شامل کیا کہ اگر فروخت کرنے کے باوجود اس نے ان غزلوں کو اپنے بیاض میں شامل رکھا تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ عارضی طور پر تو اس نے یہ غزلیں مالی مجبوریوں کے تحت خریداروں کے حوالے کردیں مگر وہ مستقل طور پر اپنے تخلیقی حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا؟ رہا خریداروں کا موقف تو میرے خیال میں ان لوگوں کو بھی اب ساجد کی غزلوں سے رضاکارانہ طور دستکش ہوجانا چاہیے کیونکہ یہ خواتین و حضرات ساجد کی غزلوں کے بل بوتے پر بے پناہ ادبی فوائد حاصل کرچکے ہیں۔

اقبال ساجد کی کلام فروشی ادبی مسلمات میں سے ہے۔ اُس کے "کلائنٹس" میں بڑے بڑے پروفیسر، صحافی، فوجی جرنل، بیوروکریٹس، "مشہور" شعراء، حکیم، مذہبی علماء، سیاستدان اور شہرت کے خبط میں مبتلا بڑے بڑے حکومتی اہلکاروں اور مذہبی سکالرز کی خوبصورت بیگمات بھی شامل ہیں۔ جن کے خبطِ عظمت کو ہوا دینے میں قومی اخبارات کے ادبی صفحات کے نیم شعراء اور نیم صحافی انچارج حضرات نے بنیادی کردار ادا کیا اور خوب مال کمایا۔ ان "کلائنٹس" کے نام جاری کرنے کی اس لیے بھی ضرورت نہیں کہ ساری ادبی دنیا انہیں اچھی طرح جانتی ہے۔ یہ لوگ خود تو تخلیق کار نہیں ہیں مگر ادب کی طاقت اور تاثیر سے پوری طرح آگاہ ہیں اسی لیے ادیبوں کے روپ دھار کر چور دروازے سے ادبی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں اور اپنی غیر ادبی شہرت کو ادبی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ ہر ادبی محفل میں اصل ادیبوں سے پہلے پہنچ کر "نشستوں" پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اور ادب ادیب کی بہبود کے لیے کام کرنے والے ریاستی اداروں کی طرف سے ملنے والی مراعات کو پچھلے دروازے سے لے اُڑتے ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا پر وہی چھائے ہوئے ہیں۔ اخبارات میں بھی انہیں کی تصویر شائع ہوتی ہیں، مقامی اور عالمی مشاعروں میں بھی بطور ادیب وہی مدعو کیے جاتے ہیں، اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والے ادبی اور ثقافتی وفود کے تبادلوں میں بھی اکثر و بیشتر یہی بہروپیے آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے۔ ان "اہلِ قلم" کی انہی "گوریلا کارروائیوں" کے باعث سچے ادیب گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مثال اس بانجھ عورت جیسی ہے جو خود تو بچہ پیدا کرنے جیسے تخلیقی تجربے سے گزرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی مگر کسی "یتیم خانے" سے بچہ Adopt کر کے "ماں" کہلوانے کا شوق پورا کر لیتی ہے۔ حالانکہ بچے کی اصل ماں تو کوئی اور ہے۔ اقبال ساجد اور ان لوگوں کے درمیان کچھ اسی قسم کا رشتہ ہے۔

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض شعراء و شاعرات کے بارے میں تو ادبی حلقوں کے علاوہ سامعین تک کو پتہ ہوتا تھا کہ یہ غزل درحقیقت اُس شاعر کی نہیں جو اسے مشاعرے میں پڑھ

رہا ہے بلکہ اس کا حقیقی وارث اقبال ساجد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے شعراء و شاعرات بکی ہوئی غزلیں مشاعروں میں پڑھتے تو اکثر منچلے سامعین آواز ے کستے "واہ اقبال ساجد واہ اقبال ساجد" ایسے میں ان شاعروں کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی۔

ساجد کی وفات سے جہاں اُس کے اہل خانہ اور عزیز و اقارب کو ایک عظیم صدمے سے دو چار ہونا پڑا وہاں ملک کے بعض مشہور شعراء و شاعرات کی شہرت کو بھی شدید خطرات لاحق میں کیونکہ ان تمام لوگوں کی ناموری کے سوتے ساجد کے تخلیقی سرچشموں ہی سے پھوٹتے تھے۔ اور اب ایسے شعراء کو اپنے نام کی لاج رکھنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

کسی دانشور نے کیا خوب کہا ہے کہ

"کبھی کبھی کسی گمنام ادیب کے مرنے سے بڑے بڑے نامور ادیب مر جاتے ہیں"

ان لوگوں کو دراصل اقبال ساجد کی موت کی صورت میں اپنی ادبی موت نظر آ رہی ہے۔ وہ اپنی شہرت کی کاغذی کشتی کو وقت کے طوفان سے بچانے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ اور ڈر تو اس بات کا ہے کہ کہیں یہ لوگ اپنی 'شہرت" کو برقرار رکھنے کے لیے کسی اور غریب تخلیق کار کو اقبال ساجد نہ بنا ڈالیں۔ آخر ان متمول شاعروں کے لیے یہ کونسی مشکل بات ہے؟

اقبال ساجد کی کلام فروشی کی عادت پر تبصرہ کرتے ہوئے عطاالحق قاسمی نے لکھا ہے کہ

"اقبال ساجد ایک عجیب و غریب شخص تھا-------- غربت اور افلاس کا مارا ہوا یہ شخص اتنا امیر تھا کہ لوگ اپنی کاروں میں اس کے پاس آتے تھے اور پچیس روپے سے لے سو روپے تک فی غزل کے حساب سے اس کی غزلیں خرید کر لے جاتے اور اپنے نام سے رسالوں میں شائع کرواتے"(14)

عطاالحق قاسمی کے تبصرے کے بعد اب ذرا اسی حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کا نقطۂ نظر بھی دیکھتے چلیے۔

"حیرت کی بات یہ نہیں کہ اقبال ساجد فوت ہو گیا ہے۔ موت سے بھلا کون، کس کو

بچا سکتا ہے؟ حیرت کی بات تو یہ کہ ادبی دنیا میں اقبال ساجد کی موت کو معمولی اہمیت بھی نہیں ملی اور اس کی وفات کے بعد المیہ ان لوگوں کا ابھارا گیا ہے جو اقبال ساجد کا خونِ دل چند روپوں میں خریدتے تھے اور اس کی غزلیں اپنے نام سے چھپوا کر شہرتِ دوام کی دوڑ میں شریک ہو جاتے تھے۔ ہم نے کئی مشاعروں میں دیکھا ہے کہ کسی شاعر کی غزل پر اگلی صفوں سے واہ واہ اُبھرتی تو شاعر کی نظریں "آداب عرض ہے آداب عرض ہے" کہنے کے لیے جھک جاتیں لیکن اقبال ساجد کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک پیدا ہو جاتی۔ ویسی ہی چمک جیسی ایک ماں کی آنکھوں میں اپنے گمشدہ بچے کو پا کر پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال ساجد نے ایسے کتنے بچوں کو اپنے سینے سے الگ کر کے سرِ عام فروخت کر دیا تھا اور اب وہ ان کے حقِ تخلیق کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن سرِ راہ جب کبھی اس کی ملاقات اپنی کسی تخلیق سے ہو جاتی تو وہ سرد آہ ہرگز نہ بھرتا بلکہ پوچھتا "میں نے بہت سی غزلیں نئی زمینوں میں لکھی ہیں آپ کے کالج کے کسی لڑکے کو شاعری کا شوق ہو تو اسے بتائیں" اور جب ردِ عمل سرد ہوتا تو وہ مایوس نہ ہوتا بلکہ کہتا "طلبہ میں شاعری کا ذوق پیدا کرنے کے لیے میں اپنی چیزیں ان کی نذر کر دیتا ہوں۔ کم قیمت پر بہت سستی"

دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال ساجد کی غزلوں کے خریدار صرف طلبہ ہی نہیں تھے۔ اس کی متاعِ تخلیق کو مالِ غنیمت سمجھنے والے چند ایسے لوگ بھی تھے جو سماجی اعتبار سے بلند عہدوں پر فائز تھے اور شانِ افسرانہ کے ساتھ جمالِ شاعرانہ کے دعویدار بھی تھے۔ اور اب اقبال ساجد کے قلمی تعاون سے صاحبِ دیوان شاعر بھی بن گئے تھے"

(15)

اگرچہ اقبال ساجد اپنی محرومیوں اور مجبوریوں کے باعث اپنی غزلیں سستے داموں فروخت کر دیا کرتا تھا مگر بعد ازاں اسے اس بات پر شدید دکھ بھی ہوتا جس کا اظہار اُس نے بارہا تخلیقی سطح

پر بھی کیا۔ وہ خود کو ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

یہ تیرے اشعار تیری معنوی اولاد ہیں

اپنے بچے بیچنا اقبال ساجد چھوڑ دے

دراصل اُس کا المیہ یہ تھا کہ سماجی سطح پر وہ بڑی حد تک ایک ناکام انسان تھا اس کے کمزور کندھوں پر ایک بیوی اور آٹھ عدد بچوں کا بوجھ تھا جبکہ اُس کا ذریعہ معاش نہ ہونے کے برابر تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ اسے شراب نوشی جیسا مہنگا شوق لاحق تھا۔ شاید بچے پیدا کرتے ہوئے اُس نے ایک بار بھی رُک کر نہ سوچا کہ ایک انسان کی پیدائش کا مطلب محض تفریح نہیں بلکہ اس کی پرورش، صحت، تعلیم، حفاظت اور روزگار کی مکمل ذمہ داری بھی قبول کرنا ہے۔

چنانچہ یہیں سے ایک اور لمیے نے جنم لیا اور اس نے محض شراب نوشی کی خاطر اپنے اندر کے شاعر اور انسان کا گلا گھونٹ کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا شروع کر دیے۔ اب وہ بے شرمی کا لبادہ منہ پر ڈالے ایک ایک کے آگے دستِ سوال دراز کرتا پھرتا۔ اُس کے مانگنے کے طریقے بھی بڑے عجیب و غریب تھے مثلاً ''میرے دانت میں درد ہے، میرا بچہ سخت بیمار ہے، میں نے کئی روز سے کھانا نہیں کھایا، بیوی ہسپتال میں داخل ہے'' وغیرہ وغیرہ۔

دوستوں کے گھروں سے کتابیں پڑھنے کے لیے لے جاتا اور بازار میں فروخت کر کے شراب پی لیتا۔ شروع شروع میں دوست احباب اس کی مدد کیا کرتے تھے لیکن آخر کب تک؟ یار لوگ ایک ایک کر کے کنی کترانے لگے۔ یونہی وہ ٹی ہاؤس یا کسی اور منظر پر نمودار ہوتا اکثر پیشانیوں پر بل پڑ جاتے۔ وہ جس ٹیبل پر بیٹھتا، شاعر ادیب کھسکنے لگتے اور ساجد یاروں کی محفل میں تنہا رہ جاتا۔

پاک ٹی ہاؤس کے منیجر زاہد سراج کے مطابق۔

''وہ ٹی ہاؤس میں بلا ناغہ آدھ پون گھنٹے کے لیے ضرور آتا تھا۔ شروع میں یوسف کامران، جاوید شاہین، یونس جاوید اور سلیم شاہد کے ساتھ وہ زیادہ تر اٹھتا بیٹھتا تھا۔

وہ جس میز پر جا کر بیٹھتا، چار پانچ منٹ بعد وہاں جھگڑا ہو جاتا کیونکہ اس کی طبیعت بہت جھگڑالو ہو گئی تھی اور وہ بہت جلد گالیوں پر اُتر آتا تھا۔ ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر وہ شراب پینے کی کوشش کرتا جس پر ایک آدھ بار اچھا خاصا جھگڑا ہوا۔ لوگ اسے اپنے پاس بٹھانا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ دوسروں پر غلط ریمارکس پاس کیا کرتا تھا۔ وہ ہر وقت شراب کے نشے میں دُھت رہتا لہٰذا میں نے تو کبھی اسے نارمل نہیں دیکھا۔ ہمارے بہت سے گاہکوں نے اُس کی مانگنے کی عادت سے تنگ آ کر ٹی ہاؤس آنا چھوڑ دیا۔

ہمارے ایک دوست آفتاب احمد تابش روزانہ یہاں دوپہر کا کھانا کھانے آتے تھے۔ جونہی وہ ٹی ہاؤس پہنچتے اقبال ساجد بھی کسی نہ کسی کونے کھدرے سے نکل آتا۔ تابش مروتاً کئی دنوں تک اسے اپنے ساتھ کھانا کھلاتے رہے لیکن آخر کار تنگ آ کر انہوں نے ٹی ہاؤس سے کھانا کھانا ترک کر دیا۔(16)

یہ دسمبر ۱۹۸۷ء کی ایک خوبصورت اور گرم دوپہر کا ذکر ہے کہ ہم چند دوست اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سبزہ زار میں کھڑے تھے کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک میلا کچیلا اور نیم دیوانہ شخص ہمیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ شکل وصورت اور لباس سے وہ بالکل گداگر دکھائی دیتا تھا۔

ہمارے ایک ہم جماعت چوہدری سرفراز نے ہمارا اُس سے تعارف کرایا۔ ''ان سے ملیے یہ مشہور شاعر اقبال ساجد ہیں''۔

اقبال ساجد جیسے خوبصورت شاعر کو اچانک سامنے پا کر ایک طرف بے حد خوشی محسوس ہوئی جبکہ دوسری طرف اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر دل پر چوٹ سی لگی۔ ابھی تعارفی کلمات ادا ہوئے چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ اقبال ساجد اشارے سے مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا ''میرا بچہ سخت بیمار ہے آپ کے پاس ایک سو روپیہ ہوگا؟'' چنانچہ ایسے خوبصورت شاعر کی

اتنی معمولی سی ضرورت سن کر میں انکار نہ کر سکا۔ یہ تھی اقبال ساجد سے میری پہلی ملاقات۔ اس کے بعد وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ تیسرے دن آیا تو پھر وہی سوال دہرایا حتیٰ کہ اس کے بعد وہ جب بھی ملتا یہی حوالہ اہم ہوتا۔ ایک ایسا معروف حوالہ جس سے لاہور کے اہل قلم اچھی طرح آگاہ تھے؟

ایک دن تو بہت ہی عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ اورینٹل کالج لاہور کے کلاس روم میں ڈاکٹر سہیل احمد خان کا لیکچر جاری تھا اور ہم سب پوری دلجمعی سے ڈاکٹر صاحب کا لیکچر سننے میں مصروف تھے کہ اچانک کسی نے دروازے پر زور سے دستک دی۔ آواز اس قدر بلند اور خوف ناک تھی کہ تمام طلبہ و طالبات گھبرا گئے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان بھی لیکچر روک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک شخص نے ذرا سا اندر جھانک کر کہا کہ ''جواز جعفری سے ملنا ہے'' آنے والے کے منہ سے اپنا نام سن کر میں تو شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ تمام طلبہ و طالبات عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے انتہائی بے بسی سے ڈاکٹر صاحب کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا تو انہوں نے کمال محبت سے مجھے باہر جانے کی اجازت دی اور میں بھاری قدموں سے چلتا ہوا کلاس روم سے باہر آیا۔ میں نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر اپنے ملاقاتی کو ڈھونڈنا چاہا تو سامنے ستون کی آڑ میں اقبال ساجد کو کھڑا پایا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے میرے ردعمل کا نوٹس لیے بغیر اپنا مخصوص سوال دہرایا۔ تمام تر شخصی برائیوں کے باوجود آج پہلی بار وہ مجھے بہت بُرا لگا مگر میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس کی مٹھی میں کچھ روپے تھما دیے۔ روپوں کے لمس کو مٹھی میں محسوس کرتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ مزید کوئی بات کیے بغیر لڑکھڑاتے قدموں سے واپس چل دیا اور میں کاریڈور میں کھڑا بُجھے دل کے ساتھ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ گیٹ سے باہر نکل چکا تو میں واپسی کے لیے مُڑا مگر دوبارہ کلاس میں جانے کی مُجھ میں ہمت نہ تھی اور میں کئی روز تک کلاس میں جانے سے کتراتا رہا۔

موت سے صرف ایک روز قبل نو دس بجے کے قریب وہ اورینٹل کالج میں وارد ہوا۔ حالت ایسی

تھی کہ ہم سب پریشان ہو گئے۔ سر پر سفید رنگ کی ٹوپی، پھٹے پُرانے کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے، آنکھیں خوفناک حد تک اندر کو دھنسی ہوئیں اور منہ کے دائیں طرف خون کی ہلکی سی سُرخ لکیر بہہ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں اسٹیل کا ایک عدد جگ اور دو گلاس تھے۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے موت لحہ بہ لحہ اس پر نازل ہو رہی ہو۔ ہمارے ایک دوست امجد راے نے اس سے پوچھا کہ "تم یہ برتن ہاتھ میں کیوں اُٹھائے پھر رہے ہو؟" جواباً اقبال ساجد ٹوٹتی ہوئی آواز میں بولا "میری بیوی نے مجھی چھین لی ہے لہٰذا میں اُس کے برتن اُٹھا لایا ہوں، میں انہیں بیچ کر مجھی خریدوں گا" اب اُس کے ارد گرد ایم۔ اے اردو کے دس بارہ لڑکے لڑکیاں جمع ہو گئے تھے۔ سبھی نے اس سے غزل سننے کی فرمائش کی، اقبال ساجد بولا "میں ایسی غزل سناؤں گا کہ آپ کو غالب بھول جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ میں پیسے لوں گا" چنانچہ ہمارے حامی بھرنے کے بعد اس نے دو عدد اپنی مشہور غزلیں سنائیں۔ ایک کا مطلع تھا

جب ہوئی رائے شماری سبھی صادق ٹھہرے
ایک ہم تھے کہ جو بستی میں منافق ٹھہرے

اور دوسری غزل کا مطلع تھا

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

ایک تو اس کی شاعری خوبصورت تھی اس پر سننے والے اردو ادب کے طالبعلم۔ ایک سماں بندھ گیا۔ غزلیں ختم ہوئیں تو ہم سب نے تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کیے جو تقریباً تین چار سو روپے بنے، اور اقبال ساجد کو پیش کر دیے۔ اسی شام میں اپنے آبائی گھر چلا گیا۔ رات کو میں جب سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو اچانک فون کی گھنٹی بج اُٹھی، میں نے رسیور اُٹھایا تو دوسری طرف ایک شاعر دوست بتا رہے تھے کہ آج سہ پہر کے وقت اقبال ساجد موت سے ہم آغوش ہو گئے۔

آخری عمر میں اقبال ساجد کی ساری ضروریات زندگی کا انحصار مانگنے پر تھا۔ اور یہ بات کسی

سے ڈھکی چھپی نہیں کہ وہ مانگا کرتا تھا۔ مرحوم کی شخصیت کے اس پہلو پر بات کرتے ہوئے اس کی بیگم نے بتایا۔

"آخری عمر میں میں نے بعض لوگوں سے سنا کہ وہ مانگنے لگے تھے۔ ایک رات دو اجنبی بندے انہیں نشے کی حالت میں گھر چھوڑنے آئے اور انہوں نے بتایا کہ ساجد بازار میں کھڑے بھیک مانگ رہے تھے۔ اس بات کا مجھے ان کی شراب نوشی سے بھی زیادہ صدمہ ہوا۔ ہم نے بہت سمجھایا اور اس قسم کی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی تو انہوں نے راتوں کو واپس گھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ پتہ نہیں کہاں رہتے تھے۔ بیٹی کی شادی کے بعد تو بالکل مُسافروں کی طرح آتے تھے" (17)

آخری عمر میں گھٹیا قسم کی شراب پی پی کر ساجد صحت سے مکمل طور پر ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور دمہ، ٹی بی، ضعف جگر، کالی کانسی اور تپ دق جیسی خطرناک بیماریاں بیک وقت اسے لاحق تھیں۔ وہ خود کہتا ہے۔

گردشِ خون پہ ہو جب گردشِ دوراں کا اثر
کیوں نہ ساجد تنِ لاغر میں تپ دق ٹھہرے

ایک عُمر تک وہ تنہا ان بیماریوں سے لڑتا رہا بالآخر ہار گیا۔ ایسا نہیں کہ سرے سے اُس کا علاج ہی نہیں کروایا گیا۔ درحقیقت وہ ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جہاں طرح طرح کی موذی بیماریوں، مضرِ صحت غذاؤں اور مسلسل فاقہ کشیوں کے باعث انسان پیدا ہوتے ہی مرنے کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ ایک تو اس کی غذا غیر معیاری تھی اس پر وہ انتہائی بد پرہیز انسان تھا لہٰذا اس کی صحت دن بدن گرتی چلی گئی!!!

کتنی ہی بار اس کے مہربان دوستوں نے اُس کا علاج کروایا۔ ضمیر الحسنین نے اپنی ذاتی کوششوں سے انشورنس کمپنی کے چیئر مین شریف جنجوعہ کے تعاون سے گلاب دیوی ہسپتال میں اسے داخل کروایا اور علاج کا سارا خرچہ انشورنس کمپنی نے ادا کیا لیکن ہسپتال سے فارغ ہونے

کے بعد وہ انہیں دوستوں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔(18)

علاوہ ازیں ہمارے دوست شاہد واسطی مرحوم نے دو مرتبہ اسے علاج کی غرض سے گلاب دیوی اور سروسز ہسپتال میں داخل کروایا۔(19) مگر وہ ہر بار ہسپتال کے بستر سے اُٹھ کر شہر میں منعقد ہونے والے کسی ایسے مشاعرے میں پہنچ جاتا جہاں سے اسے معاوضہ ملنے کی توقع ہوتی۔

گھٹیا اور مضرِ صحت اشیاء کے مسلسل استعمال اور کثرتِ مے نوشی کے سبب اقبال ساجد ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ اب وہ شراب کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اس نے ترکِ شراب کے لیے ڈالے جانے والے دباؤ کے ردِعمل میں اپنا گھر چھوڑ دیا مگر شراب نہیں چھوڑی۔ اس کی بیوہ کے بقول

''میں شروع ہی سے صوم وصلوۃ کی پابند تھی۔ جب مجھے ساجد کی مے نوشی کا علم ہوا تو میں نے انہیں سمجھایا، لڑائی جھگڑا کیا، روٹھ کر میکے چلی گئی۔ لیکن جب میری کسی بھی بات کا ان پر اثر نہیں ہوا تو تنگ آ کر میں نے اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر لیے-------------- میرے والد مرحوم بڑے پرہیزگار اور متشرع انسان تھے۔ وہ ساجد کی عادات کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ ہمارے گھر نہیں آتے تھے بلکہ انہوں نے اپنے گھر میں اقبال ساجد کا داخلہ بند کر رکھا تھا''(20)

اب اقبال ساجد اس سٹیج پر پہنچ چکا تھا جہاں اس کی زندگی اور موت دونوں شراب کے حوالے سے تھیں۔ لوگ اسے دیکھ کر مختلف طریقوں سے اپنے اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نوجوان شاعر رضی الدین رضی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''ایک مشاعرے کی صدارت عبدالعزیز خالد کر رہے تھے اقبال ساجد محفل میں آیا اور شیشی کھول لی۔ یہ گھٹیا قسم کا ٹنکچر تھا جس کی بدبو کمرے میں پھیل گئی اور شرکاءِ مشاعرہ میں سے اکثر نے اپنی اپنی ناک پر رومال رکھ لیے، پھر ایک نوجوان شاعر اٹھا، اقبال ساجد کو اپنی گود میں بھرا اور انارکلی کے چوک پر ڈال آیا۔ اقبال ساجد نے اس کا

بُرا نہیں منایا کیونکہ اب وہ اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں وہ ہر قسم کے سلوک کو
برداشت کرسکتا تھا۔"(21)

یہ سچ ہے کہ اس کی موجودگی اکثر لوگوں کے لیے ناگواری کا باعث بنتی تھی مگر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ وہ اس کی ظاہری کمزوریوں کی بجائے، اور کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں؟ اس کے اندر کے خوبصورت شاعر سے پیار کرتے تھے۔ وہ ساجد کو اپنے پہلو میں بٹھاتے اور اس کے چھوٹے موٹے مسائل بھی حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

لاہور میں رہائش پذیر ان شاعروں ادیبوں اور زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو یہ درجنوں تک جا پہنچے گی جو ہر ماہ ایک مخصوص اور معقول رقم اقبال ساجد کو باقاعدگی سے دیا کرتے تھے۔ ساجد ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ان دوستوں کے ہاں پہنچ جاتا اور یہ حضرات انتہائی رازداری سے یہ رقم اس کی مٹھی میں تھما دیتے۔

رائٹرز کیمونٹی میں ایسے لوگوں کی ایک قابل لحاظ تعداد موجود ہیں جنہوں نے بے شمار مواقع پر اقبال ساجد کی مالی معاونت کی۔ مثال کے طور پر کشور ناہید، جاوید شاہین اور دوسرے دوستوں کے تعاون سے ایک بھرپور تحریک چلائی گئی جس کے نتیجے میں جمع ہونے والی رقم سے اقبال ساجد کے بچوں کے لیے ریواز گارڈن کے عوامی فلیٹس میں ایک فلیٹ خرید کر اسے دیا گیا جو اب مرحوم کی بیوہ کے نام منتقل ہو چکا ہے اس کے علاوہ شاہد واسطی اور دیگر دوستوں کی کوششوں سے اکادمی ادبیات پاکستان نے اقبال ساجد کی زندگی ہی میں اس کے بچوں کو سات سو پچاس روپے وظیفہ دینا شروع کیا تھا جو بڑھ کر پانچ ہزار روپے ہو چکا ہے اور بڑے تواتر کے ساتھ انہیں مل رہا ہے۔ البتہ یہ الگ سوال ہے کہ اتنی قلیل رقم کیساتھ آج کی مہنگائی کے زمانے میں آٹھ دس افراد پر مشتمل کوئی خاندان زندہ رہ سکتا تھا؟

مختلف علمی و ادبی اداروں کے فنڈ پر پلنے والے سرکاری وظیفہ خوروں کی اگر فہرست ملاحظہ کی

جائے تو آپ کو اس محفل میں بیشتر ''بغے کئے معذور''، ''مالدار کنگلے'' اور ایسے ''بہروپیے اہل قلم'' نظر آئیں گے جو بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی سے مستحق ادیبوں کا حق کھا رہے ہیں۔ مگر آج تک کسی نے بھی قومی خزانے کو نقصان پہنچانے کی پاداش میں ان ''اہل قلم'' کے احتساب کی طرف توجہ نہیں دی۔ انہی ''نیم خواندہ اور نیم شعراء حضرات کو ہمیشہ حکومتی مراعات، غیر ملکی سیاحتوں اور سیاسی مناصب سے نوازا جاتا ہے اور ہر حکومت کے دربار کے سامنے یہی ''اہل قلم'' آپ کو دست بستہ اور قصیدہ بدست کھڑے نظر آئیں گے۔ جبکہ جینوئن اہل قلم اول تو سرکاری وظیفوں میں یقین نہیں رکھتا اور مجبوراً اگر اسے ان اداروں کی اعانت کی ضرورت پڑ ہی جائے تو اس کی درخواست فائلوں کے قبرستان میں دفن ہو کر رہ جاتی ہے۔

جناب احمد ندیم قاسمی جو آخری زمانے میں اقبال ساجد کے درج ذیل شعر کے باعث اس سے ناراض ہو گئے تھے۔

فراقؔ و فیضؔ و ندیمؔ و فرازؔ کچھ بھی نہیں
نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں

اس شعر کے منظر عام پر آنے کے بعد سنا ہے کہ قاسمی صاحب نے ساجد سے نہ صرف قطع تعلق کر لیا بلکہ اپنے رسالے ''فنون'' میں اس کا کلام شائع کرنا بھی بند کر دیا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے اکثر و بیشتر ساجد کی مدد کی۔ مرحوم کی بڑی بیٹی کی شادی کے موقعہ پر ماہنامہ ''نقوش'' کے مدیر جاوید طفیل نے بارات کے کھانے کے آدھے اخراجات ادا کیے۔ (22)

خود راقم نے اقبال ساجد کی دوسری بیٹی کی شادی کے لیے امجد اسلام امجد کے توسط سے پچیس ہزار روپے حکومت پنجاب کی طرف سے قائم کردہ ادیبوں کے فنڈ سے مرحوم کی بیوہ کو دلوائے۔

مالی امداد کے علاوہ بعض دوستوں نے ملازمت دلوانے میں بھی اقبال ساجد کی بھرپور مدد کی۔ زاہد سراج کے مطابق:

''کشور ناہید، سیف زلفی اور تحسین الحسن کے علاوہ کئی دوستوں نے اسے ملازمت

دلوائی لیکن ہر مرتبہ وہ نہ صرف ملازمت چھوڑ آیا بلکہ اپنے انہی محسنوں کے خلاف بیان بازی بھی کی''(23)

دراصل مرحوم ایک کم تعلیم یافتہ انسان تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کا بھی شدید ترین احساس تھا کہ وہ ایک زندہ رہنے والا شاعر ہے لہٰذا اس کی خواہش تھی کہ اسے جو بھی جاب ملے وہ اس کی شاعرانہ حیثیت کے مطابق ہو۔

ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہمیں بڑے بڑے عہدوں پر چھوٹے اور چھوٹی چھوٹی پوسٹوں پر ''بڑے'' لوگ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال ساجد کی رسمی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی مگر پھر بھی وہ کسی چھوٹے منصب پر کام کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ حیرت ہے وہ تخلیقی انسان ہونے کے باوجود بھی اپنے اس کامپلیکس پر قابو نہ پا سکا۔ حالانکہ عالمی ادب پر ایک نظر ڈالی جائے تو دنیا بھر میں بے شمار اہل قلم ایسے مل جائیں گے جو ابتدائی تعلیم سے آگے نہ بڑھ پائے اور انہیں کسی کالج یا یونیورسٹی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز بہت معمولی نوعیت کے کاموں سے کیا مگر انہوں نے اسے اپنی ذات کا کامپلیکس یا جان کا روگ نہیں بنایا۔ بلکہ ان لوگوں نے کسی رسمی تعلیم کے بغیر عالمی ادب میں گراں قدر اضافے کیے۔ اٹلی کی گریزیا ڈیلیڈ، سلواٹور کاسمیڈ و اور یوجینو مونٹیل، امریکہ کا یوجین اونیل، ولیم فاکنر، جان سٹین بک اور ارنسٹ ہمنگوے ہسپانیہ کا جیسنو بینا وینٹی اور کامیلا جوز سیلا، سویڈن کا نے بیان لیگر ڈانڈ سیٹ، آئیونڈ جونسن، ہیری مارٹنی سن، اریکسا ایکسل کر یفیڈٹ اور وان ہیڈنسٹام، جرمنی کا ہیرخ بوئل، گرہارٹ جوہان، پٹ مین، تھامس مان اور نیلی ساشز، پولینڈ کا ولادی سلاو ریمون، آئزک شیوز سنگر اور ہیزک سینکیوز، ناروے کا کانٹ ہمسن ڈنمارک کا ہیزک پو، انڈ پیڈن اور سیگر ڈانڈ سیٹ، فن لینڈ کی فرانز سیلانپا، سوئزرلینڈ کا ہرمن ہیسے، آئس لینڈ کا ہالڈور لیک سنس، روس کا مائخل شولوخوف، آسٹریلیا کا شوئٹل اگنون چلی کا پابلو نرودا یونان کا اوڈی سیس ایلیٹیس، چیکو سلواکیہ کا ہاروسلاف سیفر ے اور مڈغاسکر کا کلاڈ سائمن ایسے ہی عظیم قلمکار ہیں جو رسمی تعلیم کے

حصول کے لیے کسی کالج یا یونیورسٹی سے بڑی بڑی ڈگریاں تو حاصل نہ کر پائے مگر سب نے اپنی اپنی زبان کے ادب میں نئے امکانات کا اضافہ کیا اور انہیں عالمی لٹریچرز میں معتبر مقام دلانے کے لیے قابل قدر جدوجہد کی اور نتیجۃً دنیا کے سب سے بڑے ادبی انعام (نوبل پرائز) کے مستحق قرار پائے۔ لیکن ان تمام اہل قلم کے حالات زندگی پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی اپنی رسمی تعلیم کی کمی اور معمولی نوعیت کے کاموں سے منسلک ہونے کو کبھی اپنا احساس کمتری نہیں بننے دیا۔ جبکہ اقبال ساجد نے اس کے برعکس معمولی نوکریوں کو اپنے لیے کسر شان جانا اور وہ محنت کے بغیر چیزوں پر حق جتاتا رہا۔

1980-81ء میں بعض دوستوں کے توسط سے (ایوب رومانی کے زمانے میں) اسے ریڈیو پاکستان لاہور میں کاپی رائٹر کی جاب ملی مگر وہ زیادہ دن تک اس لیے وہاں کام نہ کر سکا کہ یہ نوکری اس کی شاعرانہ شان کے خلاف تھی۔ دراصل وہ ایک نفسیاتی مریض بن چکا تھا۔ ایک طرف اس کی شاعرانہ انا تھی اور دوسری جانب زندگی کے سنگلاخ حقائق۔ جن کے سامنے وہ اس قدر بے بس تھا کہ خورد و نوش کی معمولی چیزوں کے لیے اسے روزانہ کتنی ہی چوکھٹوں پر سر جھکانا پڑتا تھا۔ بس ایک مقام ایسا تھا جہاں وہ گردن جھکانے کی بجائے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا اور کسی قیمت پر مفاہمت یا سمجھوتہ نہ کرتا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اسے قائل کرنے کی کوشش کی جاتی کہ "فلاں شاعر تم سے بہتر ہے۔" باقی شاعروں کو تو چھوڑیں وہ تو فراقؔ، فیضؔ اور ندیمؔ کے بارے میں بھی یہ کہتا ہے۔

فراقؔ و فیضؔ و ندیمؔ و فرازؔ کچھ بھی نہیں
نئے زمانے میں اِن کا جواز کچھ بھی نہیں

بلکہ اس سلسلے میں اس کی خودسری کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اُس کا مذکورہ بالا شعر پڑھنے کے بعد احمد فراز نے گلہ کیا کہ "میں تو جدید عہد کا نمائندہ شاعر ہوں مگر تم نے میرا جواز تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے؟" اس پر ساجد نے کندھے اُچکا کر بڑی لاپروائی سے کہا "فراقؔ، فیضؔ اور ندیمؔ تو بہرحال ایسے شاعر ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن تم تو اس صف ہی میں نہیں آتے بلکہ

تمہارا نام شعر میں قافیے کی مجبوری کے سبب سے آ گیا ہے۔"

عطاالحق قاسمی نے لکھا ہے کہ:

"ایک دفعہ ساجد ٹی ہاؤس میں ایک شاعر کے ساتھ الجھ پڑا کہ تم نے جو غزل سنائی ہے اس کا فلاں شعر وزن سے خارج ہے مگر شاعر بضد رہا کہ ایسا نہیں ہے۔ جب اقبال ساجد نے بھی اپنے موقف پر اصرار کیا تو اس شاعر نے کہا کہ چلو اس شعر کا فیصلہ کسی ایسے شاعر سے کرواتے ہیں جس کے بارے میں تمہاری رائے یہ ہو کہ وہ عروض کا ماہر ہے۔ اقبال ساجد نے احسان دانش کا نام لیا اور کہا کہ انہیں تھوڑا بہت عروض کا علم ہے ان کے پاس چلتے ہیں۔ چنانچہ دونوں ٹی ہاؤس سے اٹھ کر احسان دانش کے پاس چلے گئے۔ احسان دانش نے اقبال ساجد کو دیکھ کر اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں کہا "بھتنی کے تم پھر آ گئے؟"

اقبال ساجد نے استاد کو متنازعہ شعر سنایا اور ان کی رائے طلب کی۔ استاد نے شعر سن کر کہا "اس شعر میں کوئی سقم نہیں۔ پوری طرح وزن میں ہے۔" اس پر متذکرہ شاعر نے اقبال ساجد کو مخاطب کر کے کہا "اب تو تمہاری تسلی ہو گئی؟" اقبال ساجد نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا اور بولا "استاد کو عروض کیا پتہ؟ تم اپنے شعر پر نظر ثانی کرو۔ یہ بے وزن ہے"(24)

اقبال ساجد کے پاس اس شعری انا کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اس انا کا اندازہ ان دو اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

عہدِ جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟
گر میں نہیں تو اور یہاں زندہ کون ہے؟
تنہا ہے کون، کس کے یہ بازو ہیں اگنت
تھامے ہوئے یہ پرچم آئندہ کون ہے؟

۱۹۷۰ء کے آس پاس اسے گانا سننے کا شوق پیدا ہوا اور وہ اپنے بعض دوستوں کے ساتھ کوٹھے پر جانے لگا لیکن جلد ہی اس نے بازارِ حُسن جانا چھوڑ دیا کیونکہ اپنے محدود وسائل اور بے روزگاری کے باعث وہ اس مہنگے شغل کو جاری نہ رکھ سکا۔(25)

دراصل اقبال ساجد کی پوری زندگی محرومیوں کی داستان ہے، وہ معاشرے کا ٹھکرایا ہوا ایک ایسا فرد تھا جسے ذہنی سکون اور استحکام میسر نہیں تھا۔ اس کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے جبکہ سماجی ذمہ داریاں بہت زیادہ۔ ان ذمہ داریوں کی انجام دہی میں ناکام رہنے کے بعد اس نے فرار کا راستہ اختیار کیا اور شراب میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہی شراب اس کی جان کا روگ بن گئی اور اس شغل کو جاری رکھنے کے لیے اسے بڑے بڑے ناپسندیدہ کام بھی کرنے پڑے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وہ شراب پینے کے لیے اپنا خون تک فروخت کرنے لگا تھا جس کی گواہی اس کی غزلوں سے بھی ملتی ہے

ہسپتالوں میں یہ کاروبار بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خون کا بیوپار بھی کرنا پڑا

بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ شراب نوشی کی خاطر چھوٹی موٹی چوریوں سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اقبال ساجد کے ایک سابق ہمسائے اور معروف پنجابی شاعر احمد راہی کے بقول

''اقبال ساجد میرے گھر آتا تو میں اسے منہ نہیں لگاتا تھا کبھی کبھار وہ زبردستی اندر گھس آتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اسے شراب پلائی اور پیسے بھی دیے۔ لیکن جاتی دفعہ وہ میرے گھر سے ٹیپ ریکارڈر چرا کر لے گیا۔ علاوہ ازیں وہ اکثر ہماری چیزیں چرا لیا کرتا تھا''(26)

اسی قسم کے واقعات بعض دیگر دوستوں نے بھی بیان کیے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اقبال ساجد کی بیشتر سرگرمیاں دوستوں کی نظر میں ناپسندیدہ تھیں۔

وہ گالیاں دیتا تھا، چوریاں کرتا تھا، غلیظ ریمارکس پاس کرتا تھا، بھیک مانگتا تھا مگر اس کے باوجود اُس کے اندر دوسروں سے محبت کرنے والا انسان بھی موجود تھا۔ وہ دوستوں سے مانگتا ہی نہ تھا بلکہ کبھی کبھی وہ دوستوں پر کچھ خرچ بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ وہ دوستوں کو اپنے ہاں کھانے پر بلائے، ان کی تواضع کرے مگر حالات اس کی اِن آرزؤوں کے حق میں نہ تھے۔ وہ کہتا ہے:

ہائے رے حالات اک مہمان لوٹانا پڑا
میں نہیں گھر پہ یہ بچے سے کہلوانا پڑا

ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جب وہ دوستوں کیساتھ بیٹھ کر انہیں چائے پلاتا اور کھانا کھلانا چاہتا تھا اور ایسے میں اگر کوئی دوست اس کی پیشکش قبول نہ کرتا تو وہ مارنے مرنے پر تیار ہو جاتا۔ حامد یزدانی نے ایک ایسا ہی واقعہ سنایا۔

''نیشنل سنٹر لاہور میں مشاعرہ پڑھنے کے بعد میں چند دوستوں کے ہمراہ ٹی ہاؤس کی طرف آ رہا تھا کہ راستے میں اقبال ساجد آ گیا۔ کہنے لگا'' میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا'' اس کی بات سن کر بعض دوستوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ لہٰذا وہ لوگوں کی ناگواری کے پیش نظر ہمارے پیچھے پیچھے ذرا فاصلے پر چلنے لگا۔ ٹی ہاؤس کے سامنے پہنچ کر کہنے لگا'' حامد ان لوگوں کیساتھ مت اٹھا بیٹھا کرو۔ یہ شاعر نہیں اُٹھائی گیرے ہیں'' اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر بولا'' آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ'' میرے انکار کرنے پر وہ ناراض ہو گیا اور جب اس کے شدید اصرار کے باوجود میں نے کھانا نہیں کھایا تو مرحوم نے وہ روپے جو اسے مشاعرے سے ملے تھے نکال کر زمین پر پھینکتے ہوئے کہنے لگا'' تم میرے ساتھ کھانا کھانا بھی پسند نہیں کرتے'' اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ہم نے بصد مشکل روپے اس کی جیب میں ڈالے اور اسے ایک رکشے میں سوار کرا کے ڈرائیور کو تاکید کی کہ وہ اسے

ایواز گارڈن، اس کے گھر تک چھوڑ آئے۔(27)

اسی طرح ستار طاہر کا کہنا ہے کہ ایک دن اقبال ساجد اس بات پر لڑنے مرنے پر تیار ہوگیا کہ۔

''میں اس کی دعوت پر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں''(28)

ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ساجد ہمیشہ سے کوئی بُرا انسان نہیں تھا بلکہ حالات اور ضروریات نے اسے بہت سے ناپسندیدہ کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ پسے ہوئے طبقے کا ایک ایسا فرد تھا جسے ذہنی اور مالی استحکام میسر نہیں تھا۔ ہمارے ملک کی اکثریتی آبادی ایسے افراد پر مشتمل ہے جن کی ماہوار آمدنی سے روزمرہ کی ضروریات زندگی کا پورا ہونا خاصا مشکل ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ قدرے پُرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں کیونکہ انہیں پورا یقین ہوتا ہے کہ مہینے کے اختتام پر ایک مخصوص رقم انہیں ضرور ملے گی۔ لیکن جس شخص کی آمدنی نہ ہونے کے برابر ہو اور اس کے کندھوں پر ایک بڑے خاندان کا بوجھ بھی ہو تو اسے سکون کہاں سے میسر آئے گا؟ وہ کسی سماجی اور اخلاقی ضابطے کا دل سے کیونکر احترام کریگا؟

ساجد کا المیہ یہ ہے کہ وہ جدید عہد کے زر پرست معاشرتی کلچر کا ساتھ نہ دے سکا۔ ایک ایسا گنہگار معاشرہ جو اپنے سارے گناہوں کا بوجھ اپنے ضعیف ترین عضو پر ڈال دیتا ہے۔ بھلا آج کی سوسائٹی میں سماجی سطح پر شاعر سے زیادہ کمزور اور کون ہو سکتا ہے؟

جو سوسائٹی اپنی بات سننے کے لیے تیار نہ ہو وہاں اقبال ساجد جیسے شاعر کی بات پر کون کان دھرتا؟ یہ درست ہے کہ ڈاکٹر طارق عزیز جیسا معذور فنکار اپنی ذاتی محنت کے بل پر سوسائٹی کے ایک معزز ممبر کی حیثیت سے آبرو مندانہ زندگی بسر کر رہا ہے مگر ایسی مثالیں بہت کم میسر آتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ زر پرست اور سرمایہ دار سوسائٹی جینئس اور تخلیق کار افراد کو ضائع کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ ایسا معاشرہ صرف انہی لوگوں کو استحکام بخشتا ہے جو اس کے اسٹینڈرڈز اور ویلیوز کا پورا پورا ساتھ دیتے ہیں۔ شاعر چونکہ خود اقدار سازی کرتا ہے اس لیے وہ سرمایہ دار سوسائٹی کی انسان خور قدروں پر عمل پیرا ہونے کی بجائے انکے خلاف ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔

ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ غیر تخلیقی افراد معاشرے کی صرف ایک سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جبکہ فنکار کو سوسائٹی کی بیک وقت دو سطوح پر زندہ رہنا پڑتا ہے۔ وہ سوسائٹی کا رکن ہوتا ہے جس پر بہت سی سماجی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جبکہ بطور فنکار وہ سوسائٹی کے لیے تخلیقی ذمہ داری بھی پوری طرح نبھاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی حساس طبیعت میں ایک قسم کی فطری آزادی بھی ہوتی ہے جو غیر ضروری قسم کی معاشرتی پابندیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ نتیجتہً شاعر اپنی زندگی کے ان دو رُخوں کے درمیان وحدت اور توازن قائم رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔

جب فنکار سوسائٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے ان سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ براہ نہیں ہو پاتا تو غیر تخلیقی معاشرہ اسے ایک ناکام انسان قرار دے کر اس سے اپنی سہولیات و مراعات واپس لینے کا تقاضا کر دیتا ہے۔ لیکن فنکار کے لیے سماجی حیثیت کے مقابلے میں اس کا تخلیقی منصب کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اس لیے فنکار دنیاوی لذتوں اور آسائشوں کے مقابلے میں تخلیق کیساتھ زندگی گذارنا پسند کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے ہر پہلو اور تمنا سے دستکش ہو سکتا ہے مگر تخلیقی زندگی سے ہاتھ کھینچنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتا۔ جب فنکار کی سماجی اور تخلیقی زندگی کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو یہیں اس سے کا المیہ جنم لیتا ہے۔

اقبال ساجد ایک غریب آدمی تھا اور سماجی سطح پر اس کے پاس کوئی بڑا سرکاری یا غیر سرکاری عہدہ بھی نہیں تھا جبکہ ہمارے موجودہ ادبی معیارات کے مطابق صرف اسی شاعر کو بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے، رسائل و جرائد اسی کے فن و شخصیت پر "قصیدہ نمبر" شائع کرتے ہیں جو کسی فائدہ مند پوسٹ پر فائز ہو؟ لمحۂ موجود کے لٹریری سٹینڈرڈز کے مطابق صرف اسی شاعر کو "ملک الشعراء" کا خطاب دیا جاتا ہے جو کسی بڑے ادبی رسالے کا ایڈیٹر ہو۔ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں میں اس کی پی۔آر ہو، بزنس مین ہو، اہلِ قلم کو بڑے بڑے ہوٹلوں میں عشایئے دے سکتا ہو۔ فائیو سٹار ہوٹلوں میں اپنی اور دوسروں کی کتابوں کی تقریب رونمائی کروا سکتا ہو، مقامی اور عالمی ادبی مافیا کا سرگرم رکن ہو، کسی موروثی ادبی جاگیر کا جانشین یا کسی منفعت بخش ادبی

مزار کا مجاور ہو۔ موجودہ ادبی صورت حال میں ایسے ہی "اہل قلم" کی سرکاری اور غیر سرکاری میڈیا تک رسائی ہوتی ہے، انہی کو بڑے بڑے ریاستی اور غیر ریاستی، مقامی وغیر مقامی "ادبی" ایوارڈز عطا کیے جاتے ہیں، انہی کو عالمی مشاعروں میں مدعو کیا جاتا ہے، انہی کے امریکہ، یورپ اور گلف تک جشن منائے جاتے ہیں، پوری دنیا میں انہی کی اعزازی بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کا مکمل نیٹ ورک موجود ہے، پوری دُنیا میں ان کے نیم شاعر قسم کے "میزبان" موجود ہیں۔ ملکی میڈیا میں اثر و رسوخ کے باعث یہ "اہل قلم" بیرون ملک بسنے والے شناخت کے بحران میں مبتلا خواتین و حضرات کے مقامی اخبارات کے رنگین ادبی صفحات پر انٹرویوز اور تصاویر شائع کروا کے حق نمک ادا کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں تک پاکستان میں ادب کے قارئین ان میں سے محض چند جینوئن لکھنے والوں کے ناموں سے آگاہ تھے مگر آج امریکہ، یورپ اور گلف کے ہر ملک میں اس قسم کے بہت سے نیم شاعر سامنے آرہے ہیں جن کی کتابیں شائع کر کے پاکستانی پبلشرز جیبیں بھرنے میں مصروف ہیں۔ سوؤ وصول کرنے کے بعد پبلشرز کسی پاکستانی شاعر سے مسودے کی "مرمت" کراتے ہیں اور پھر اشاعت کے بعد فائیو سٹار ہوٹلوں میں اس "مرمتیہ" شاعری کی تقاریب رونمائی پر ہزاروں ڈالرز خرچ کیے جاتے ہیں۔ بلکہ گزشتہ چند سالوں سے تو پبلشرز کی ایک نئی قسم سامنے آئی ہے جو ملکوں ملکوں گھوم کر بیرون ملک بسنے والوں کے مسودے اکٹھے کر کے لاتے ہیں اور پاکستان سے ان کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ آپ ان پبلشرز کو "موبائل" پبلشرز اور مذکورہ ادب کو "ڈالریہ ادب" کہہ سکتے ہیں۔

کئی مقامی شعراء نے تو "رضا کارانہ" طور پر "اصلاحِ سخن" کی ذمہ داری بھی اپنے "لمبے ہاتھوں اور مضبوط کندھوں" پر اٹھائی ہے۔ وہ پاکستان کے اچھے شعراء کی دس بیس کتابیں سامنے رکھ کر کسی امریکن یا یورپین شاعر یا شاعرہ کے لیے چند روز میں "نئی" کتاب تیار کر دیتے ہیں۔ ادھر اس قسم کی کتاب منظر عام پر آتی ہے ادھر "متاثرین" اپنے کلام کی "ریسائیکلنگ" پر موبائل

پبلشرز کو بدعائیں دیتے نظر آتے ہیں۔ بعض تو ''مہمان شاعر'' سے احتجاج بھی کرتے ہیں مگر وہ بیچارہ ''معصومیت'' سے محض منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ یہ اقبال ساجد کے عہد کا ادبی منظر نامہ ہے مگر ان ادبی رجحانات و روایات سے اقبال ساجد کا دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اسی لیے ادبی حلقے اس کی خوبصورت شاعری پر گفتگو کرنے کی بجائے اس کی شخصی کمزوریوں پر انگلیاں اٹھاتے رہے۔

مہذب اور علم دوست معاشروں میں فن سے بڑھ کر فنکار کو اہمیت دی جاتی ہے کہ فن بہر حال فنکار ہی کے فکری نتائج کا ثمر ہوتا ہے جبکہ ہمارے ہاں اگر چہ فن کو تھوڑا بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن فنکار کو ابھی تک وہ مقام حاصل نہیں ہو پایا جس کا وہ بجا طور پر مستحق ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی نے ابھی تک طاقت اور دولت کی پرستش سے نکل کر علم کی افادیت کو سمجھنے اور علم کی بالادستی کو تسلیم کرنے کی طرف قدم نہیں اٹھایا۔

ہمارے لوگ آرٹ گیلریوں میں کسی مصور کی تصویروں کی نمائش دیکھ کر، کسی موسیقار کی خوبصورت دُھن سن کر، کسی سنگتراش کے فن کا اعلیٰ نمونہ دیکھ کر، کسی خوبصورت اور مشاق رقاصہ کے رقص کے زیر و بم دیکھ کر یا کسی شاعر کی اعلیٰ پائے کی نظم پڑھ کر چند لمحوں کے لے لطف اندوز تو ہوتے ہیں لیکن کیا کبھی کسی آرٹ کے دلدادہ شخص نے ایک لمحے کے لے بھی سوچا کہ لاکھوں انسانوں کو تخلیق اور تفریح کی دولت مہیا کرنے والا، اور ان لازوال فن پاروں کا خالق اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگا؟

بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کی دہلیز پر مہذب اور علم دوست معاشروں میں ایسے پُر سکون شہر وجود میں لائے جا رہے ہیں جہاں صرف شاعر ادیب، مصور، موسیقار، دانشور، سائنسدان، سنگتراش، سنگرز، رقاص اور دیگر تخلیقی شعبوں سے وابستہ افراد رہائش پذیر ہیں۔ ان پُر سکون شہروں میں کسی قسم کی آلودگی کی اجازت نہیں۔ ایسے تخلیقی شہروں کے تخلیق کار باشندوں کو وہاں کی حکومتیں سکالرشپ دیتی ہیں تاکہ وہ سماجی و معاشی پریشانیوں سے آزاد ہو کر اپنی قوم کے دامن کو مسلسل ایجادات و تخلیقات کے موتیوں سے بھرتے رہیں۔ مگر دوسری جانب تیسری دنیا کے

ایسے منتشر معاشرے ہیں جہاں تخلیق کار سارا دن کارخانوں اور دفتروں میں انتھک محنت کرتے ہیں اور راتوں کو آرام کرنے کی بجائے اپنے نامکمل تخلیقی منصوبوں پر کام کرتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی ابھی تک دولت اور طاقت کے گریز سے باہر نہیں نکل پائی۔ ابھی ہم نے علم اور تخلیق کی عظمت کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ ہمارے ہاں آرٹ کو دولت اور طاقت کے مقابلے میں حقیر سمجھا جاتا ہے اسی لیے ان شعبوں سے وابستہ افراد سے بھی سوسائٹی کے بیشتر لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔

ساغر صدیقی، استاد دامن اور اقبال ساجد جیسے تخلیق کاروں کا تنگ و تاریک کھوٹھڑیوں میں فاقہ مستی کی حالت میں جان دے دینا ہمارے ہاں فن اور فنکار کی ناقدری اور اور زر پرست معاشرے کی بے رحمی اور بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

جدید صنعتی معاشرہ "مقابلے" کا معاشرہ ہے۔ یہ عہد فن اور فنکار کے لیے احترام اور سافٹ کارنر نہیں رکھتا۔ یہاں انسان کی دولت اس کے انسان ہونے کا معیار ہے۔ ہر جگہ give and take کا اصول کارفرما ہے، یہ ایک ایسی انحطاط پذیر سوسائٹی ہے جہاں زرعی اقدار و اخلاقیات پسپائیت کی حالت میں ہیں جبکہ صنعتی اخلاقیات ابھی پوری طرح وجود میں نہیں آئیں۔ لہٰذا سوسائٹی ایک قسم کے تہذیبی بحران کا شکار ہے۔ ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر زرعی ہے اور صنعتی ترقی نہ ہونے کے برابر ہے مگر میڈیا کے عالمگیر کردار نے صنعتی سوسائٹی کے ثمرات و برکات کے برعکس منفی کلچر کو ساری دنیا میں پھیلا دیا ہے جس کے نتیجے میں تمام غیر مستحکم معاشروں کو ایک نئے بحران کا سامنا ہے۔ اس قسم کی بحرانی سوسائٹی اقدار کی بجائے مقدار میں یقین رکھتی ہے جبکہ فنکار اعلیٰ قدروں کی ترویج کے ساتھ ساتھ نئی قدریں تخلیق بھی کرتا ہے۔ ایسا معاشرہ جو اپنے گھروں کو بھرنے میں مصروف ہو وہ انسان کے اندر کو بھرنے والی قدروں پر کیسے یقین رکھے گا؟

مختلف چیزوں سے ساری عمر گھر بھرتا رہا
دکھ ہوا ہے ذات کے کمرے کو خالی دیکھ کر

(جواز جعفری)

یہی اقبال ساجد کا المیہ ہے کہ وہ جدید اور زر پرست معاشرے کے قیامت خیز Competition کی نذر ہو گیا۔

یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ اقبال ساجد نے اپنے آپ کو خود تباہ کیا اپنی جان کو بڑی تیزی سے خرچ کیا بلکہ وہ تو ایک ایسے سگریٹ کی مانند تھا جو بیک وقت دونوں اطراف سے جل رہا ہو۔لیکن ساجد کی اس تباہی میں کچھ نہ کچھ ہمارا بھی ہاتھ ہے۔ہم میں سے بہت سے لوگوں نے اسے زہر کھانے کے لیے پیسے دیے مگر اس کے مضر اثرات نہیں بتائے ،اسے اعتدال سے کام لینے کا مشورہ نہیں دیا،اس کی جلی کٹی باتیں سن کر ناراض ہو گئے،اُس پر اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے،لا علاج سمجھ کر اس کا پوری طرح علاج نہیں کرایا۔یہ نہیں سوچا کہ اس کے آٹھ بچوں کا مستقبل اس کی صحت اور زندگی سے وابستہ ہے اور یتیم بچے اگر خود زندہ رہ سکتے تو یتیم خانے کیوں وجود میں آتے؟ بلکہ افسوس تو یہی ہے کہ ہمارے اہل قلم کے پاس یہ باتیں سوچنے کے لیے فرصت نہیں بلکہ وقت کے سمندر میں ہماری حیثیت ان جزیروں کی سی ہے جو ایک ہی سمندر میں واقع ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں؟

اقبال ساجد کی وفات پر ہمارے اہل قلم نے جس بے حسی کا ثبوت دیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لٹریری کمیونٹی میں اس کی موت پر نہ تو کسی نے آنسو بہائے اور نہ ہی کسی نے قرار داد تعزیت پیش کی۔پاک ٹی ہاؤس میں ادیب شاعر معمول کے مطابق قہقہے لگا رہے تھے بلکہ بعض لوگوں نے تو اس کی اچانک موت پر یوں محسوس کیا جیسے ان کے سروں سے کوئی بہت بڑا خطرہ ٹل گیا ہو؟

ٹی ہاؤس کے منیجر زاہد سراج کے مطابق

''اقبال ساجد کی موت پر میں نے یہاں ادیبوں کی طرف سے کوئی خاص ردِ عمل نہیں دیکھا۔لوگ روزانہ کی طرح آئے ،باتیں کیں ،ہنسے ہنسائے اور گھروں کو لوٹ گئے۔مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی ادبی حلقے نے ساجد کے مرنے پر تعزیتی اجلاس بلایا ہو؟''

البتہ تعزیتی کالم لکھنے کے "ماہر" بعض کالم نگاروں نے اس کی موت پر وردناک کالم ضرور لکھے۔

یہ ردعمل کسی حد تک درست ہے بلکہ اس پر حیران ہونا ہی نہیں چاہیے۔ دولت کی دوڑ میں سرپٹ بھاگتے ہوئے جس معاشرے کے پاس اپنے بارے میں سوچنے کے لیے وقت نہ ہو وہ رُک کر اقبال ساجد کے بارے میں کیونکر سوچے گا؟ یہ قصور کسی فردِ واحد کا نہیں بلکہ یہ تو ایک اجتماعی ذہن کا ردعمل ہے۔ سماجیات کے ماہرین کے مطابق کوئی سوسائٹی صرف اس وقت پھلتی پھولتی ہے جب اس کی سوچ پر اجتماعی رنگ غالب ہو اور اس لمحے زوال پذیر ہونے لگتی ہے جب فرد اپنی ناک سے آگے دیکھنا چھوڑ دے۔ ہم ایک ایسے زوال پذیر معاشرے کے باشندے ہیں جس کے دیگر اداروں کے ساتھ ساتھ سوچنے والا طبقہ بھی زوال کی طرف گامزن ہے۔ جس سوسائٹی کے تخلیق کار ایک خوبصورت سماج کا خواب دیکھنا ترک کر چکے ہوں، وہ اپنے اردگرد بسنے والے کروڑوں انسانوں کے بنیادی انسانی حقوق اور آزادیوں کے لیے قلمی جدوجہد کرنے کی بجائے ذاتی مراعات و مفادات کے حصول کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف ہوں، ٹھٹھرتی راتوں میں اپنی ملک کے فٹ پاتھوں پر سوئے ہوئے ہزاروں لوگوں کا نوحہ لکھنے کے بجائے سرکاری رہائشی سکیموں میں پلاٹ کے حصول کی درخواست لیے بادشاہ کے دربار کے سامنے لائن میں کھڑے ایک دوسرے کو کہنی مار کر آگے نکلنے کی جدوجہد میں مصروف ہوں، ایسے غیر تخلیقی معاشرے میں کوئی ادیب عزت اور خوشحالی کی زندگی کیسے جی سکتا ہے؟ جس سوسائٹی میں اکیسویں صدی کی دہلیز پر حکمرانوں اور ایجنسیوں کی ناک کے عین نیچے ایک صد پھول جیسے بچوں کا خون بہا دیا جائے اس کی اخلاقی حیثیت کے بارے میں دو آراء کیسے ہو سکتی ہیں؟

ساجد ایک ایسے ہی ظالم اور غیر تخلیقی معاشرے کا باشندہ تھا۔ وہ خود بھی ایک مظلوم انسان تھا جسے لوگوں نے پہلے تو ہر قسم کے ناپسندیدہ کام کرنے پر اُکسایا اور انجام کار اس کے ساتھ ساتھ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اُسی کے بے گناہ کندھوں ڈال کر تمام تر ہمدردیوں سے محروم کر دیا۔ یعنی خود ہی اسے ترغیب گناہ دی اور پھر خود ہی اسے دار پر کھینچ دیا۔

''اقبال ساجد بہت عجیب و غریب شخص تھا۔ خوبصورت شعر کہتا تھا، مہمل باتیں کرتا تھا۔ وہ انا کا پہاڑ تھا مگر ہر روز ریزہ ریزہ ہوتا تھا۔ وہ غریب بہت تھا مگر اپنی غزلوں کی دولت بانٹتا پھرتا تھا۔ سہانے خواب دیکھتا تھا مگر ڈراؤنی تعبیروں کا سامنا کرتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کی تواضع کرنی چاہتا تھا مگر اسے خالی جیب کی ندامت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے بچوں سے بے حد محبت کرتا تھا مگر ان کے آنسو بھی نہیں پونچھ سکتا تھا۔ اسے اپنے گھر سے محبت تھی مگر اس سے محبت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تھے۔''(29)

یہی عجیب و غریب شخص ۱۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جبکہ اس کے بیوی اور بچے شہر میں ایک رشتے دار کے گھر پر منعقد ہونے والی تقریب میں گئے ہوئے تھے، لڑکھڑاتے غیر متوازن قدموں سے اپنے گھر میں داخل ہونے لگا تو اس کی دہلیز ہی پر گر گیا اور جب ہمسائے اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھے تو ان پر انکشاف ہوا کہ وہ تو مر چکا ہے۔ اس کا آدھا جسم گھر کی دہلیز کے باہر اور آدھا دہلیز کے اندر مردہ پڑا ہوا تھا۔

عہدِ جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟

ادیب اسی طرح سوسائٹی کی پیداوار ہوتا ہے جس طرح اس کا فن، زندگی کی طرف اس کے مخصوص ردِ عمل کی پیداوار ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا فن کار شعوری یا لاشعوری سطح پر روحِ عصر کی ترجمانی کرتا ہے۔ روحِ عصر کا مطلب ہے کسی خطے یا قوم کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی افکار و عمل میں اشتراک۔ یعنی ان کے سوچنے اور عمل کرنے میں ہم آہنگی ہو خواہ یہ حماقت ہی کیوں نہ ہو۔ یہ روحِ عصر کسی عہد کے شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ میں برقی رو کی طرح موجود ہوتی ہے۔

بقول ہڈسن:

> "اگر چہ ہر مصنف کا اپنا انفرادی اسلوب اظہار ہوتا ہے لیکن زمانے کی غالب روح ----------- وہ جو کچھ بھی ہو ------------- بلواسطہ یا بلا واسطہ طور پر ہر مصنف کے فن میں منعکس ہوتی ہے"

کوئی بھی شخص روحِ عصر کے اثرات سے چاہے بھی تو دامن نہیں بچا سکتا۔ جیسا کہ گوئٹے نے کہا تھا کہ ہر شخص جس طرح اپنے ملک کا باشندہ ہے اسی طرح وہ اپنے زمانے کا بھی باسی ہوتا ہے اور رینان کے لفظوں میں ہر شخص کا تعلق اس کی نسل اور زمانے سے ہوتا ہے خواہ وہ اپنے زمانے اور نسل کے خلاف ہی ردِ عمل کا مظاہرہ کرے۔

اسی طرح ادب جن افکار و جذبات کا اظہار کرتا ہے وہ کسی زمانے کے ساتھ وابستہ اور اس سے مشروط ہوتے ہیں۔ زمانہ کسی ادیب و شاعر کے ذہن پر اس لیے اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ اس کا ذہن انتہائی Sensitive ہوتا ہے اور اس کے اندر کسی واقعہ کو قبول کرنے یا اس کے خلاف ردِ عمل کی صلاحیت دیگر تمام افراد سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ادیب ان چھوٹے بڑے

واقعات کو قبول کرنے کے بعد انہیں نہایت لطیف پیرائے میں اپنے فن میں سمو کر پیش کر دیتا ہے۔
شلیگل اور ڈرائیڈن نے بھی ادب اور روح عصر کے باہمی تعلق کی نشاندہی کی تھی لیکن انہوں نے اس تعلق پر کسی مستحکم نظریے کی بنیاد رکھنے کی کوئی مربوط کوشش نہیں کی۔ اس سلسلے میں تین اور راں بو کا طریق کار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ تین کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ادب کا مطالعہ سماجی طاقتوں کی پیداوار کے طور پر کیا۔

تین کے نزدیک ادیب اپنے زمانے، معاشرے اور دیگر حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے مطابق کسی قوم کی نسلی خصوصیات بھی اس کے ہر عہد کے ادب میں اپنا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ادب میں سوشل اور کلچرل عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں وہ ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی کو صرف اس کی تخلیقات ہی نہیں تاریخ عالم (World history) کے دو باب (chapter) سمجھتا ہے۔

اس کے ہاں ادب کے عمرانی تصور میں سائنسی اور منطقی نقطۂ نظر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ادیب کی زندگی کے حالات، اُس کا اپنی معاشرت اور روحِ عصر کے ساتھ تعلق، نسل، سماج اور اُس کے فکری و جذباتی ارتقاء کا کھوج لگا کر ہم اس کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں جو اس کے فن و شخصیت کی تفہیم میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تنقید ادب میں نہ صرف شاعر کی سوانح حیات (بائیوگرافی) کو مرکزی اہمیت حاصل ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھیں تو ہم ان تمام سماجی تبدیلیوں اور معاشرتی ارتقاء کا جائزہ لیں گے جنہوں نے ادیب کے ذہن اور سوانح حیات پر گہرا اثر ڈالا۔

اس سے قبل کہ ہم اقبال ساجد کے فن کا تجزیہ کریں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے عہد کے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور فکری حالات کیا تھے؟ انسانی حقوق اور آزادیوں کی حالت کیا تھی؟ اور ان مسائل کی طرف شاعر کے اپنے ردِعمل کی نوعیت کیا تھی؟ شاعر کا تعلق کس طبقے سے تھا اور اُس نے اپنے فن کے ذریعے کن طبقوں کو اپنی طرف متوجہ کیا نیز وہ خود کن طبقوں سے متاثر ہوا؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ اپنے شاعرانہ اور تخلیقی جوہر کے باوجود سماجی سطح پر بطور انسان ناکام کیوں رہا؟

آیئے سب سے پہلے اقبال ساجد کے عہد اور خاندانی پس منظر کا مطالعہ کرتے ہیں۔

اقبال ساجد ۱۹۳۹ء میں جب پیدا ہوا تو اس وقت ہندوستان کی فضا آزادی کے نعروں سے گونج رہی تھی ۔ برصغیر پر انگریزی سامراج کا تسلط تھا اور سیاسی ، معاشی اور تہذیبی سطح پر یہاں کے باشندوں کی زندگی طرح طرح کی مشکلات کا شکار تھی ۔انگریزوں نے ہندو اور مسلم دونوں قوموں میں ایک ایسا وفادار ، جاگیردار طبقہ پیدا کرلیا تھا جو ہر وقت ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے کمربستہ رہتا تھا۔ہندوستان کے باہر بھی براعظم افریقہ اور ایشیاء کے بیشتر ممالک سامراج کے شکنجے میں قید تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سے ممالک میں غلامی سے نجات اور آزادی کے حصول کے لیے تحریکیں بھی چل رہی تھیں اور لوگ سیاسی طور پر خاصے بیدار ہوتے جارہے تھے۔برصغیر میں یہ سیاسی اور تہذیبی کروٹوں کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے۔ دوعظیم جنگوں کے اثرات کے نتیجے میں سامراجی اقوام کے لیے ایشیاء اور افریقہ کے لوگوں کو مزید غلام بنائے رکھنا تاریخی اعتبار سے ممکن نہ رہا تھا۔

اگر ہم اس عہد کا احاطہ مختصر لفظوں میں کرنا چاہیں تو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ پورا انسانی معاشرہ دو طبقات میں تقسیم ہوکر رہ گیا تھا ۔ یعنی آقاؤں اور غلاموں میں۔انہی حالات میں یو۔پی (بھارت) ضلع سہارنپور کے ایک پسماندہ گاؤں "لنڈھورا" میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے،والدین جس کا نام اقبال ساجد رکھتے ہیں۔وہ پانچ سال کی عمر کو پہنچتا ہے کہ اس کا والد اسے تنہا چھوڑ جاتا ہے۔نتیجتہً اس کی بیوہ ماں اس جذباتی اور معاشی دھچکے کی تاب نہ لاتے ہوئے ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے۔آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ ہونے کے باعث ساجد ڈھنگ سے رسمی تعلیم بھی حاصل نہیں کرپاتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ابھی بمشکل آٹھ برس کا ہوگا کہ ہندوستانی زندگی سیاسی ،سماجی اور تہذیبی سطح پر ایک بہت بڑی تبدیلی-------- تقسیم ہندوستان-------- سے دوچار ہوگئی اور نتیجتہً انسانی رشتوں اور تعلقات کی نوعیت ہی بدل گئی۔

قیام پاکستان سے پہلے کی زندگی اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود قدرے مربوط اور متحد

زندگی تھی۔ لیکن پارٹیشن کے بعد جو نئی سوسائٹی تشکیل پائی وہ آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود انتشار کا شکار تھی۔ اس پر اس نوزائیدہ مملکت کے باشندوں کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ یہ منتشر ہجوم ابھی قوم میں تبدیل نہ ہو پایا تھا کہ اس کے قائد دارفانی سے کوچ کر گئے۔ اس کے ساتھ ہی قیادت کا ایک ایسا بحران پیدا ہوا جو آج تک ختم ہونے میں نہیں آرہا ہے۔ ہر شخص راتوں رات پورے ملک کی قیادت سنبھالنے کے لیے ہر طرح کے قومی اور ملکی مفادات کو داؤ پر لگانے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔

یوں تو پوری زندگی اڈہاک ازم کے سہارے چل رہی تھی، جیسا کہ آج بھی ہمارے ہاں عوامی یا ملکی فلاح و بہبود کا کوئی مستقل منصوبہ نہیں بنایا جاتا بلکہ ہر کام عارضی اور وقتی فوائد کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ مقتدر حلقے بڑے بڑے قومی منصوبوں میں سے کمیشن لینے کے لیے سابقہ حکومتوں کے پراجیکٹس سبوتاژ کر دیتے ہیں-------- لیکن اس نئے دیس کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ ملک پورے نو برس تک بغیر آئین کے چلتا رہا اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء میں کہیں جا کر وزیراعظم چوہدری محمد علی کے عہد میں پاکستان کا پہلا آئین وجود میں آیا لیکن یہ آئین ابھی دو ڈھائی برس بھی نہ چل پایا تھا کہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے ایوبی مارشل لاء نے اس کے تقدس کو تاراج کر دیا اور وطن عزیز آمریت کے اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی اور انسانی حقوق و آزادیاں سلب کر لی گئیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جب اقبال ساجد شعور کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔

۱۹۵۸ء میں اقبال ساجد ۱۹ برس کا ہو چکا تھا۔ اس کے اردگرد سماجی اور سیاسی سطح پر جو کچھ ہو رہا تھا وہ ان تمام واقعات سے نہ صرف باخبر تھا بلکہ ان حالات سے پوری طرح متاثر بھی ہو رہا تھا۔ اس وقت سماجی سطح پر انسان دن بدن اپنی شناخت کھو رہا تھا اور ذہنی و جذباتی طور پر عدم استحکام کا شکار ہو چکا تھا۔ اس عہد میں ایک طرف انگریزوں کا پیدا کردہ جاگیردار طبقہ تمام تر ملکی وسائل پر قابض تھا اور دوسرے طرف قیام پاکستان کے بعد حالات میں معاشی لوٹ کھسوٹ اور جائیداد کی ناجائز الاٹمنٹوں کے نتیجے میں ایک نیا سرمایہ دار طبقہ ابھر کر سامنے آرہا تھا۔ گویا ملکی دولت، وسائل

اور ذرائع پیداوار چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد نئی سوسائٹی میں جعلی الاٹمنٹوں کے لیے کیا کیا حربے استعمال ہو رہے تھے۔اس کی ایک تصویر قدرت اللہ شہاب کے ہاں دیکھتے چلیے۔

"آزادی کے وقت جو ہندو اور سکھ بھارت چلے گئے تھے وہ صوبہ پنجاب میں بہت سی فیکٹریاں، سینما گھر اور دیگر صنعتی ادارے چھوڑ گئے تھے۔حکومت پاکستان کا فیصلہ تھا کہ ان فیکٹریوں کو کسی بھی صورت بند نہ ہونے دیا جائے اور انہیں مسلمان مہاجرین میں الاٹ کر دیا جائے جو اس قسم کا کاروبار یا جائیداد بھارت میں چھوڑ آئے ہیں۔اس مقصد کے لیے ایک بورڈ قائم کیا گیا اور ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے میں بھی اس بورڈ کا ممبر تھا۔بورڈ قائم ہوتے ہی درخواستوں کا ایسا سیلاب اُمڈ آیا کہ الامان والحفیظ۔جو کلیم داخل ہوئے ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ امرتسر سے لے کر دہلی، لکھنو اور پٹنہ تک جتنے صنعتی ادارے اور سینما گھر تھے وہ زیادہ تر مسلمانوں ہی کی ملکیت تھے۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ مطالبے جائز حقوق پر مبنی ہونگے لیکن بہت سے کلیم صریحاً جھوٹ، فریب اور جعلسازی کی پیداوار تھے۔جتنا بڑا آدمی ہوتا اس کی تہہ میں اتنا ہی بڑا جھوٹ اور فریب کارفرما ہوتا۔کچھ لوگ بنفس نفیس بھارت جاتے اور وہاں پر متروکہ املاک کے کسٹوڈین کے دفتر سے اپنی مرضی کے کاغذات اور سرٹیفکیٹ بنوا لاتے تھے۔بھارتی کسٹوڈین کے دفتر میں بھی جعلسازی کی فیکٹری کھلی ہوئی تھی۔رشوت کے ریٹ مقرر تھے اور منہ مانگی قیمت دے کر ہر قسم کی ملکیت کی تصدیق کرائی جا سکتی تھی۔اس صنعتی املاک کی تقسیم نے حرص و ہوا کے جو دروازے کھولے اس نے ہمارے معاشرے میں اخلاقی کٹھن سرٹن، بداطواری، بددیانتی، جھوٹ، فریب اور جعلسازی کو بڑا فروغ دیا۔(30)

یہ تھا اس عہد کا سماجی وسیاسی منظر نامہ جس کے پس منظر میں اقبال ساجد نے ہوش سنبھالا۔ وہ اس ساری صورت حال کو ایک بالغ نظر شاعر کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ ان تمام طبقوں کا نمائندہ تھا جنہوں نے اچھے دنوں کی آس میں پاکستان کی طرف ہجرت کی تھی لیکن جب لوٹ کھسوٹ کی اس سوسائٹی میں ان کے نرم اور سہانے خواب استحصال اور خود غرضی کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوئے تو اقبال ساجد ان تمام مظلوم طبقوں کی نمائندہ آواز بن کر سامنے آیا۔

رُخ روشن کا، روشن ایک پہلو بھی نہیں نکلا
جسے میں چاند سمجھا تھا وہ جگنو بھی نہیں نکلا

☆

نازک نظر پہ بار یہ نازک سماں ہے آج
پانی پہ عکس شاخ پہ پتا گراں ہے آج
آنکھوں میں اڑ رہی ہے فریبوں کی گرم ریت
جھیلوں کی بستیوں میں دھواں ہی دھواں ہے آج

☆

گھونٹیں نہ خواہشوں کا گلا کیوں دلوں میں لوگ؟
جب ہاتھ ہی دعاؤں سے تاثیر کھینچ لے

☆

اب کے برس بھی تازہ اُجالوں کے ہاتھ سے
چسپاں فصیلِ وقت پہ ظلمت بہت ہوئی

☆

ہاتھوں پہ بہہ رہی ہے لکیروں کی آب جُو
قسمت کا کھیت پھر بھی ہے بنجر پڑا ہوا

☆

ایک بھی خواہش کے ہاتھوں میں نہ مہندی لگ سکی
میرے جذبوں میں نہ دولہا بن سکا اب تک کوئی

☆

اقبال ساجد کی شاعری میں اسکی ذاتی زندگی کی محرومیاں اور نارسائیاں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں اگر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایک مربوط لڑی میں پرو دیا جائے تو اس کی زندگی کی ایک جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے گی۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اقبال ساجد نے اپنی ذاتی محرومیوں، دکھوں اور المیوں کو ایسی تخلیقی مہارت کے ساتھ فن میں سمویا ہے کہ یہ تصویر ساجد کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کی بھی مکمل تصویر قرار پاتی ہے۔ اُس کی شاعری اس کی اپنی ذات کے علاوہ اس کے طبقے کے ہر شخص کی آپ بیتی ہے۔ یہ کہانی ہے پسے ہوئے استحصال زدہ معاشرے کے اس فرد کی جو خود ایک تخلیق کار ہے لیکن تقدیر کے ہاتھوں ایک غیر تخلیقی اور زر پرست معاشرے کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی جو گھروں کو مادی اشیاء سے بھرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دھن میں ایک بے رحم اور غیر انسانی دوڑ میں مصروف ہے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس کی غیر انسانی اور غیر تخلیقی فضا میں انسانی اور تخلیقی رویے دم توڑ رہے ہیں۔ جہاں خون کے رشتوں پر دولت کی بنیاد پر استوار ہونے والے رشتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایک ایسا تخلیق دشمن، مشینی معاشرہ جو فنکار کو بھی ایک بے جان مشین سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ساجد اس بے مہر سوسائٹی پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

کیا ملا اقبال ساجد ندرتِ فن بیچ کر
اب گزارا وقت کر دانتوں کا منجن بیچ کر
کھول لے بازار میں چہرے سجانے کی دکان
وقت ہے پیسہ کمالے رنگ و روغن بیچ کر
تُو نے جو لکھا ہے اسکو کوڑا کرکٹ ہی سمجھ
پیٹ کا دوزخ بُجھا سوچوں کا ایندھن بیچ کر

اس قسم کی غیر تخلیقی سوسائٹی میں جہاں افکار و اقدار پر دولت غالب آ جائے، ایک فن کار کس طرح بھرپور اور خوشحال زندگی بسر کر سکتا ہے؟ ایک ایسی سوسائٹی جس کی بنیاد ہی لوٹ کھسوٹ، استحصال اور خود غرضی پر رکھی گئی ہو، جہاں کے باشندے واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہو چکے ہوں۔ ایک طبقہ ملک کے تمام وسائل اور ذرائع پیداوار پر قابض ہو، ملکی خزانے پر شب خون مارنے کے بعد وہ اکثریت کی محنت پر عیاشی کر رہا ہو، اس نے اپنی رہائشی کالونیاں، تفریح گاہیں ہسپتال اور تعلیمی ادارے تک الگ کر لیے ہوں اور سوسائٹی میں طبقاتی جدوجہد کو روکنے کے لیے اپنے فرسودہ اور بیمار فلسفوں کا پرچار کر رہا ہو، تاکہ اس کے استحصال کی طرف سے لوگوں کا دھیان ہٹایا جا سکے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو اپنی لوٹ مار کو جاری رکھنے کے لیے قانون، اخلاق، طاقت، مذہب اور اسٹیبلشمنٹ جیسا ہر حربہ استعمال کرتا ہے جبکہ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جس کے پاس اپنے ہاتھوں (محنت) کے سوا اور کچھ نہیں۔ موجودہ عہد کے وسائل، علم، خوشحالی، مسرت، احترام، محبت، روزگار اور گھر میں سے اس کے حصے میں کچھ نہیں آتا۔ وہ صبح سویرے گھر سے اپنی محنت بیچنے نکلتا ہے اور شام کو تھکن اوڑھے گھروں کو لوٹتا ہے۔ اسی طبقے کے ہونہار بچے سڑکوں پر پانی اور اخبار بیچتے ہیں، جوتے پالش کرتے ہیں، گاڑیوں کے شیشے صاف کرتے اور ہوٹلوں میں برتن دھوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسخ معاشرہ ہے جس نے ان بچوں کے ہاتھوں میں کتاب کی بجائے برش اور جوتے تھما دیے ہیں۔ اقبال ساجد بالعموم اسی طبقے کی زندگی کی تصویریں اپنے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے:

رات فٹ پاتھ پر دن بھر کی تھکن کام آئی
اُس کا بستر بھی کیا، سر پر بھی تانے رکھا

☆

ہمارا سونا ہی فٹ پاتھ کی بہار ہوا
جو چیز بنی برنگِ جمال بنی ہے

☆

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

☆

آج کے دن بھی مرا رزق نہ مجھ پر اترا
آج کے دن بھی پڑوسی مرے رزاق ٹھہرے

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جہاں صداقت کا معیار دولت ہے، جس کے پاس جس قدر دولت ہے وہ اتنے ہی بڑے جھوٹ کو سچ ثابت کرسکتا ہے۔ہاں البتہ اس غیر تخلیقی معاشرے میں اگر کوئی شخص جھوٹا ہے اور منافق ہے تو وہ فنکار ہے۔ساجد اس غیر انسانی روّیے پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے۔

جب ہوئی رائے شماری سبھی صادق ٹھہرے
ایک ہم تھے کہ جو بستی میں منافق ٹھہرے

ساجد کا تعلق اسی پسے اور پسماندہ طبقے سے تھا جو زندگی کی اس بے رحم مادی دوڑ میں بہت پیچھے رہ چکا ہے اور اُس پر زندگی میں آگے بڑھنے کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں، یہ ہماری سوسائٹی کی وہ بُری تصویریں ہیں جہاں پانچ مرلے کے گھر میں پانچ پانچ خاندان جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔جہاں بھوکے بچوں کو جھوٹی تسلی دینے کی خاطر خالی ہنڈیا کے نیچے آگ جلائی جاتی ہے۔لوگ سردی اور گرمی سے بچنے کے لیے موسموں کی شدتیں پہنتے ہیں اور گھروں میں فاقے بچھاتے ہیں۔

چپ چاپ گھر کے صحن میں فاقے بچھا دیے
روزی رساں سے ہم نے گلہ کچھ نہیں کیا
غربت کی تیز آگ پر اکثر پکائی بھوک
خوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا؟
غربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی
کیسے کہیں کہ اس نے عطا کچھ نہیں کیا

ایک زمانہ تھا جب مہمان کو رحمتِ خداوندی تصور کیا جاتا تھا۔ پردیسی اور مہمان کو کھانا کھلانا قدر کا درجہ رکھتا تھا مگر شاید یہ وہ زمانہ تھا جب مہنگائی نے ابھی سوسائٹی پر یلغار نہیں کی تھی، آج سفید پوش طبقے کے لیے مہمان نوازی کی روایت کو جاری رکھنا روز بروز مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ کم وسائل اور بڑھتی ہوئی ضروریات نے لوگوں کو ان کی عزیز ترین آرزوؤں سے دستکش ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ اقبال ساجد کا یہ شعر دیکھئے جو ہماری سوسائٹی کے ہر فرد کی کہانی دکھائی دیتا ہے۔ اتنا خوبصورت اور حقیقت سے قریب ترین شعر شاید وہی کہہ سکتا تھا کیونکہ اُس کا اپنا تعلق بھی اُسی طبقے سے تھا۔

ہائے رے حالات اک مہمان لوٹانا پڑا
میں نہیں گھر پر یہ بچے سے کہلوانا پڑا

مگر شاعر بہانے بلکہ دھوکے سے مہمان کو دروازے ہی سے رخصت کر دینے کے بعد اپنے اس حربے پر خوش ہونے کی بجائے الٹا اداس اور غمزدہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس عمل کے پیچھے اس کی اخلاقی پستی نہیں معاشی مجبوریاں اور محرومیاں ہیں۔ وہ فطرتاً ایسا نہیں چاہتا مگر حالات کا یہی تقاضا ہے۔ یہی اُس کا سچ ہے اور وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔

اقبال ساجد کو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے روزانہ طرح طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ جسم و جان کے تعلق کو قائم رکھنا ہی اس کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اس رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے اسے کیسے کیسے ناپسندیدہ اور غیر اخلاقی کام کرنے پڑتے ہیں۔

چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔

چھینا جھپٹی کی مزاروں پر تبرک کے لیے
بھوک جب حد سے بڑھی خیرات کا کھانا پڑا
جانور کی کھال پہنی اور چلا پنجوں کے بل
بن گیا بہروپیا بازار میں آنا پڑا
دوسروں کے جرم اپنے نام لکھوانا پڑے

دوستو! روٹی کی خاطر جیل بھی جانا پڑا
کیا کروں مجبور تھا حق چھیننے کے واسطے
غیر اخلاقی رویہ مجھ کو اپنانا پڑا

☆

ہسپتالوں میں یہ کاروبار بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خون کا بیوپار بھی کرنا پڑا
چلتے پھرتے تھیٹروں میں ایک جوکر کی طرح
ہنسنے رونے کا مجھے کردار بھی کرنا پڑا
چائے کی پیالی میں ہاں میں ہاں ملانا پڑ گئی
دوستوں میں خود کو برخوردار بھی کرنا پڑا

مندرجہ بالا تمام اشعار میں ہمیں اپنے اور اپنی سوسائٹی کے معروف چہرے نظر آتے ہیں۔ ان اشعار کے کردار ہماری سوسائٹی کے حقیقی کردار ہیں۔ معاشرے کی ایسی مکمل اور سچی تصویریں بہت کم شعراء کے ہاں ملتی ہیں۔ یہ ایک ایسے مسخ معاشرے کی کہانی ہے جہاں شرف انسانی کا تحفظ بھی مشکل ہو گیا ہے۔ خوف، انتشار، غربت، جنگ، قحط، بیماری، بے گھری، ہجرت، ناانصافی اور جہالت کا شکار انسان، اپنی صنف کے اعتبار سے تو انسان ہی دکھائی دیتا ہے مگر درحقیقت اسے ایک غیر انسانی زندگی کی طرف دھکیل دیا گیا ہے۔ یہ صرف ہماری ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے ہر معاشرے کی کہانی ہے۔

یہ ایک ایسے غیر محفوظ انسان کی کہانی ہے جو ذہنی اور معاشی عدم استحکام کا شکار ہے جس کے مسائل نا تمام اور وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں، جس کے پاس کوئی ملازمت ہے اور نہ کوئی بزنس۔ اقبال ساجد مسائل کے انبار بے پایاں کے نیچے دبے ہوئے شخص کی نمائندہ ترین آواز ہے۔

بدن پہ میل اور چہرے پہ گرد راہ کا رہنا
کوئی رہتا یہاں ہے شخص بے تنخواہ کا رہنا

اقبال ساجد تنخواہ دار طبقے کو بظاہر رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے مگر لمحہ موجود میں یہی طبقہ سب سے زیادہ مشکلات کا شکار ہے۔

بے روزگاری تیسری دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح پاکستان کا بھی سب سے خوفناک مسئلہ ہے ہمارے ہاں اس مسئلے کا تعلق وسائل کی کمی سے زیادہ پلاننگ کے فقدان اور وسائل کی نامنصفانہ تقسیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مراعات یافتہ طبقے کا میٹرک پاس فرد بھی رشوت اور سفارش کے بل پر براہ راست افسر بن جاتا ہے جبکہ غریب طبقے کا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان اپنی تمام تر لیاقت کے باوجود بیکاری اور بے روزگاری کا شکار ہے۔ اس بیروزگاری کے نتیجے میں پڑھی لکھی نسل کے اندر ناراض خوئی، ڈپریشن اور ردعمل جنم لیتا ہے۔ اس ردعمل کے ڈانڈے عدم تحفظ، فرقہ واریت، نسل پرستی، لسانی گروہ بندی، دہشت گردی، انتہا پسندی اور علیحدگی پسندی سے جا ملتے ہیں۔ ہمارے آج کے بیشتر مسائل کی جڑیں اس بیکاری و بے روزگاری ہی کے اندر پیوستہ ہیں اور بیروزگاری کا تعلق براہ راست سماجی و معاشی ناانصافی سے ہے۔ اقبال ساجد کے ہاں بیروزگاری کی چند تصویریں دیکھتے چلیے۔

اب پڑھے لکھے بھی ساجد آ کے بیکاری سے تنگ
شب کو دیواروں پہ چسپاں پوسٹر کرنے لگے

دوسرے طرف وہ بے کاری سے مایوس نوجوان نسل سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

بیکار کیوں ہو شہر کی سڑکوں پہ بیٹھ کر
ہاتھوں پہ قسمتوں کے نوشتے پڑھا کرو

اس ساری منافقانہ اور غیر مساوی صورت حال کو دیکھ کر وہ حکمرانوں کی جھوٹی، جعلی اور ایک طرفہ اقتصادی پالیسیوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ ایسی پالیسیاں جنھیں ورلڈ بنک، آئی ایم ایف اور دیگر سود خور مالیاتی اداروں کے ایجنٹ تشکیل دے کر دونوں طرف سے تنخواہیں وصول کرتے ہیں۔ یہ ایسی عوام دشمن پالیسیاں ہیں جن کے ثمرات کبھی عام آدمی تک نہیں پہنچے۔ اقبال ساجد کے خیال میں ساری ترقی اور خوشحالی محض کاغذی منصوبوں تک محدود ہے۔

دکھاوے کے لیے خوشحالیاں لکھتے ہیں کاغذ پر
ہم اس دھرتی پہ ورنہ رزق کے چکر میں رہتے ہیں

☆

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

ہماری جدید شاعری کی ایک کمی یہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے قاری کے دل میں شاعر سے ملاقات کی حسرت رہ جاتی ہے مگر اقبال ساجد کی شاعری میں اس کی اپنی ذات جگہ جگہ شعر کے پردے سے جھانکتی ہے۔اس کی شاعری دراصل اس کی آپ بیتی ہے۔اس آپ بیتی کے مطالعے سے ہم پر کھلتا ہے کہ کس طرح غیر تخلیقی معاشرے نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا؟ اُس کے اردگرد لوگ مفادات اور خود غرضی کی جنگ لڑ رہے تھے، ہر کوئی دوسرے کو کہنی مار کر اور ایک دوسرے پر پاؤں رکھ کر آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس صورت حال میں اقبال ساجد کے سامنے تین راستے تھے۔

1۔موجودہ استحصالی نظام کا حصہ بن کر لوٹ مار میں برابر کا شریک بن جاتا۔2۔اس ظالمانہ اور غیر انسانی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا۔3۔اس غیر مساوی، معاشی، سماجی اور ادبی صورت حال پر منافقانہ خاموشی اختیار کر لیتا۔

اقبال ساجد نے ان تینوں میں سے اپنے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔اور اپنے زمانے کی معاشی، سماجی اور تخلیقی ناہمواریوں، برائیوں اور ناانصافیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ وہ کہتا ہے۔

بتا اس دور میں اقبال ساجد کون نکلے گا
صداقت کا علم لے کر اگر تو بھی نہیں نکلا؟

اقبال ساجد جانتا تھا کہ اس صورت حال میں بطور تخلیق کار اور ایک سوچنے والے فرد کے طور پر اُس کا ایک کردار بنتا ہے لہٰذا اس نے اپنے کردار کو پہچان کر اسے ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ تن تنہا ایک جنگ لڑ رہا تھا جس سے دیگر لوگ بہت پہلے دستبردار ہو چکے تھے۔ وہ لوگ یا تو اس غلط نظام کا حصہ بن چکے تھے یا پھر اس غیر انسانی سسٹم کے سامنے کب کے ہتھیار ڈال چکے تھے اور تو اور اس کی اپنی ادیب کمیونٹی کے بیشتر لوگ اپنے اپنے نظریات سے ہاتھ کھینچ کر سرکاری "ادیبوں" کی قطار میں قصیدہ بدست جا کھڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ اہل فکر طبقہ ہمیشہ حکمران کی آنکھوں میں کھٹکتا رہتا ہے۔ بیشتر حکومتیں چونکہ ادب کی تاثیر اور سماجی کردار سے بخوبی آگاہ ہوتی ہیں۔ اس لیے حکومتیں ادیب کی نظریاتی و فکری بنیادوں کو منہدم کرنے کے لیے ایوارڈز، خطابات، جاگیروں اور غیر ملکی سیاحتوں کے ساتھ ساتھ خوف اور تحریص جیسا ہر حربہ استعمال کرتی ہیں۔ اتفاق سے اقبال ساجد ایک ایسے عہد کا شاعر ہے جہاں بیشتر اہل قلم سرکاری سرپرستی میں آنے کے لیے بے قرار ہیں۔ وہ پی۔ آر اور چاپلوسی کے فن میں ایک دوسرے کو مات دے رہے ہیں، ہر دوسرا اہل قلم ریاستی ایوارڈ نہ ملنے پر ایوارڈ یافتگان، ایوارڈ کمیٹی اور حکمرانوں کو صلواتیں سناتا دکھائی دیتا ہے۔ ادب کے حوالے سے تو سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اہل قلم ریاستی سرپرستی کی اتنی شدید تمنا ہی کیوں کرتا ہے؟ کیا ریاستی ایوارڈز کے بغیر ادیب کے لیے تخلیقی کام جاری رکھنا ناممکن ہے؟ کیا دنیا بھر کا عظیم ادب ریاستی پرستی کا نتیجہ ہے؟ ایک سوال یہ بھی پوچھے جانے کے لائق ہے کہ جن اہل قلم کو سرکاری ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے اس اعزاز کی وصولی کے بعد ان کی تخلیقی زندگی میں کیا تبدیلیاں آئی ہیں؟ کیا ریاستی مراعات سے لطف اندوز ہونے کے نتیجے میں ان کی تخلیقی قوت اور سرگرمیوں میں اضافہ ہوا؟ اور پہلے کی نسبت کائنات اور انسانی مسائل میں ان کی دلچسپی کی نوعیت کیا ہے؟

ہمارے نزدیک شاعر پہلوان نہیں ہوتا کہ جسے ایک عدد سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخلیق کے لیے تو ذہنی اور ماحولیاتی آزادی اولین شرط ہے۔ لکھنے والا حیات و کائنات کے بارے میں پوری فکری آزادی کے ساتھ سوال اٹھاتا ہے۔ کسی فرد یا ادارے کی سرپرستی قبول کرنے کا واضح مطلب ادیب کا اپنی فکری آزادی سے دستبردار ہونا ہی ہے۔

سیدھی سی بات ہے کہ کوئی انسٹیٹیوشن صرف دو صورتوں میں ادیب کی سرپرستی کرے گا۔

(1) ادیب پہلے ہی اس ادارے کے مفادات کی نگرانی اور انہیں پروموٹ کر رہا ہو۔ (2) یا پھر مراعات کی وصولی کے بعد اپنی فکری آزادی سے دستکش ہو کر اس ادارے کے مفادات کے تحفظ اور ترویج کے لیے اپنی خدمات وقف کر دے؟ اگر کسی ادیب کا تخلیق کردہ ادب سرکار کی نظروں میں پسندیدہ نہیں تو پھر اسے سرکاری خلعت اور ایوارڈ کیسے مل سکتا ہے؟

ہمارے عہد کا المیہ یہ ہے کہ ہمارا ادیب لفظ کی سچائی اور قوت پر یقین رکھنے کی بجائے پی۔ آر میں ایمان رکھتا ہے۔ جتنی تگ و دو وہ بیچارہ ایوارڈز کے حصول کے لیے بااثر دروازوں پر دستکیں دینے کے لیے کرتا ہے اس سے آدھی محنت اور توجہ سے وہ اعلیٰ پائے کا فن پارہ تخلیق کر سکتا ہے۔ سرکار، مرعات دے سکتی ہے لازوال زندگی تو صرف تخلیق عطا کرتی ہے۔ اِس ادبی پس منظر میں اقبال ساجد نے اپنے فن کو حکمرانوں کی جھولی میں ڈالنے سے انکار کر دیا۔ وہ کُھلے لفظوں میں رائے فروشی کی مذمت کرتا ہے۔

کٹاؤں سر کو ، نہ بیچوں قلم کی حُرمت کو
عزیز جاں سے زیادہ ہے اپنی رائے مجھے
میں خود بھی اپنے اشاروں پر آج تک نہ چلا
وہ انگلیوں پہ بھلا کس طرح نچائے مجھے
میں اشتہار لگاؤں بدن پہ غزلوں کے
وہ چاہتا ہے کہ شو کیس میں سجائے مجھے

غیر تخلیقی معاشرے کے خلاف اس نے جو جنگ شروع کی تھی اس لڑائی میں اس نے کبھی ہتھیار ڈالنے کے بارے میں نہیں سوچا، وہ خون کے آخری قطرے تک ظلم کے خلاف نبرد آزما رہا۔ نتیجۃً اردگرد کی تمام تر "غیر تخلیقی قوتیں" اس کے خلاف متحد ہو گئیں اور اس کا سماجی و ادبی بائیکاٹ کر دیا۔ لیکن اس صورت حال سے وہ ذرہ برابر نہیں گھبرایا بلکہ اُس نے محاذِ جنگ کو اور تیز کر دیا۔ دراصل وہ فرد کے مقابلے میں "لفظ" کی فتح چاہتا تھا۔ لفظ جس کے بغیر ہر شئے بے معنی ہے

اُس نے غیر تخلیقی اور زر پرست معاشرے میں مقام بنانے کے لیے کوئی "شارٹ کٹ" اختیار نہیں کیا بلکہ وہ "ترقی" کے لیے غلط ہتھکنڈے استعمال کرنے کی بجائے لفظ کی طاقت اور حُرمت میں یقین رکھتا تھا۔

ایک طرف وہ لوگ تھے جو راتوں رات کروڑ پتی بن جانے کی دُھن میں اخلاق، قانون، اقدار، مذہب اور رشتوں کو پامال کررہے تھے۔ جبکہ دوسری طرف اقبال ساجد تخلیق کار ہونے کے ناطے تخلیقی عمل کو اعلیٰ ترین عمل سمجھتا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

دنیا نے زر کے واسطے کیا کچھ نہیں کیا ؟
اور ہم نے شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا
پچھلے برس بھی بوئی تھیں لفظوں کی کھیتیاں
اب کے برس بھی اس کے سوا کچھ نہیں کیا
سُرخ لہو سے یہ پھلواڑی کرتا ہوں
میں لفظوں کی کھیتی باڑی کرتا ہوں

☆

بُھوک جس نے اُتاری مرے جسم پر بے بہا اُس نے مجھ پہ کرم بھی کیا
میری سوچوں کو شاداں بیاں بخش دیں میرے لفظوں کو رزقِ معانی دیا

☆

وہ ایک ایسے معاشرے میں تخلیقی جنگ لڑ رہا تھا جس کی بنیادیں تجارت پر اٹھائی گئی ہیں۔ تجارتی سوسائٹی میں پروان چڑھنے والی ذہنیت کے نزدیک دولت ہی دُنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس ذہنیت کے مطابق دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے خواہ وہ مادی اشیاء ہوں یا کسی تو دو لیتے انسان کا ضمیر۔ اسی ذہنیت پر طنز کرتے ہوئے اقبال ساجد کا لہجہ اچانک بڑا کٹیلا ہو جاتا ہے۔

حاصل کرو مرے لیے نفرت کرائے پر
لے آؤ سارے شہر کی خلقت کرائے پر

صاحب اگر ہیں آپ تو سب آپ کے غلام
ہر شئے ملی گی حسب ضرورت کرائے پر

اس نفرتوں کے شہر میں کچھ دن کے واسطے
جھوٹی سہی ملے تو محبت کرائے پر

جسموں کی منڈیوں میں سبھی کچھ ملے گا دوست
تنہائی ، قُرب ، لمس و حرارت کرائے پر

ظالم معاشرے کی صفائی میں کچھ نہ کہہ
قاتل کے حق میں دے نہ شہادت کرائے پر

جائز ہے کاروبار کی خاطر یہاں پہ سب
چندہ کفن کے واسطے،میت کرائے پر

پیسہ ہے تیرے پاس تو کچھ نام بھی کما
لے آ کسی غریب سے شہرت کرائے پر

اقبال ساجد نے اس زر پرست سوسائٹی کے سامنے جھکنے کی بجائے اپنے خاندان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے، اپنے خون پسینے سے تخلیق کی گئی غزلوں کو سستے داموں نیلام کرنا شروع کر دیا۔ استحصال کی یہ بڑی ہی انوکھی صورت تھی جس پر ایک شاعر کو مجبور کر دیا گیا تھا۔ لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اس استحصال میں صرف غیر تخلیقی لوگ ہی شامل نہیں تھے بلکہ اس تخلیقی لوٹ کھسوٹ کے حوالے سے بعض ایسے نام نہاد "تخلیق کاروں" کے نام بھی سامنے آتے جو سماجی اعتبار سے بڑے بڑے فائدہ بخش عہدوں پر فائز تھے۔ یہ لوگ بیس پچیس روپے میں اس کی غزلیں خرید کر لے جاتے اور معمولی قیمت پر ہتھیائی ہوئی ان غزلوں کے ذریعے مقامی اور غیر ملکی مشاعروں کے ذریعے ہزاروں روپے کماتے۔ ایسے ہی لوگوں پر طنز کرتے ہوئے ساجد کہتا ہے۔

میر اپیراہن پہن کر لوگ شہرت پا گئے
میں تو ننگا ہو گیا اپنا نیاپن بیچ کر

عزتیں اُن کو ملیں جن کی کوئی عزت نہ تھی
ہم کہ رسوائی کا باعث ہو گئے فن بیچ کر

☆

کچھ لوگ لے اڑے ہیں مری انفرادیت
شہرت ملی تھی جس سے وہ رُسوائی چھن گئی
کچھ شعوری سطح پر ،کچھ لاشعوری طور پر
کارِ فکر وفن میں اب سب کی مدد کرتا ہوں میں
شعر و سخن کی دنیا میں اک مدت سے
نئے نئے تیار کھلاڑی کرتا ہوں

☆

مفت میں تقسیم کی ساجد متاعِ شاعری
جس نے اپنا قُرب اپنا یا سخنور ہوگیا

☆

دوسروں کے واسطے لکھا ہوا لگتا ہے جھوٹ
اپنی سچائی کو اکثر آپ روکرتا ہوں میں

☆

وہ بھی ہے ساجد مرے جذبوں کی چوری میں شریک
اس کی جانب کیوں نہیں اٹھتی نگاہِ شک کوئی

☆

لیکن اپنے فن کے اس سرعام نیلام پر بعد ازاں اسے دکھ بھی ہوتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تیار کردہ ''کھلاڑی'' اور چند سکوں کے عوض اس کی فنی انفرادیت اُڑا لینے والے ''شعرا'' ان غزلوں کے حقیقی خالق سے زیادہ عزت، شہرت اور مراعات سے لطف اندوز ہورہے ہیں تو ردِعمل کے طور پر بعض اوقات وہ اپنے اور ان ''کلائنٹس'' کے درمیان طے پانے والے غیر تحریری

''معاہدے'' کا احترام ایک طرف رکھ کر ان کی ''ادبی عظمت'' کا بھانڈا سر بازار پھوڑ دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اور ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب کبھی اسے احساس ہوتا ہے کہ ایک سچا تخلیق کار ہوتے ہوئے وہ ان غیر تخلیقی لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے تو وہ بڑی بے بسی کے عالم میں اپنے آپ کو کوستا ہے۔

یہ ترے اشعار تیری معنوی اولاد ہیں
اپنے بچے بیچنا اقبال ساجد چھوڑ دے

اقبال ساجد جس ظالمانہ نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے ہوئے تھا۔ یہی آہستہ آہستہ اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ چنانچہ اس کے خلاف ایک اور چال چلی گئی اور اسے شراب نوشی کی عادت میں مبتلا کر دیا گیا۔ بعض روایات کے مطابق اس سازش میں اس کی اپنی کمیونٹی کے لوگ بھی شریک تھے۔ مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس لوگوں نے اسے شراب نوشی کا عادی بنایا تھا۔ بعد ازاں انہی نے اس کے سماجی بائیکاٹ کی تحریک بھی چلائی۔ اب لوگ ساجد کو دیکھ کر راستہ بدل لیتے، وہ جس محفل میں پہنچتا لوگوں کی پیشانیاں شکن آلود ہو جاتیں۔ نتیجتاً وہ گھر اور باہر دونوں جگہ تنہائی کا شکار ہو گیا۔ اور اب وہ اس سطح پر پہنچ چکا تھا جہاں گھر اور باہر کے تقاضے پورے کرنا اُس کے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ وہ اپنے ہی اندر سمٹنے لگا۔ دوستوں اور عزیزوں نے اسے ملنا اور اس کے گھر آنا تک ترک کر دیا۔ لہٰذا وہ بڑی حسرت سے کہتا ہے:

ایسے گھر میں رہ رہا ہوں دیکھ لے بے شک کوئی
جس کے دروازے کی قسمت میں نہیں دستک کوئی
آنکھیں تو لگی رہتی ہیں دروازے پہ لیکن
ہوتی ہے خوشی اپنی ہی آمد سے زیادہ

☆

اس حادثے سے بڑھ کر کیا حادثہ ہو ساجد
اپنے ہی گھر میں قید۔ تنہائی کاٹتے ہیں

اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ ہر تعلق اور رشتے سے بیگانہ ہو گیا۔ اُس نے گھر کو خیر باد کہا
اور فٹ پاتھ آباد کر لیا۔

رات فٹ پاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اس کا بستر بھی کیا سر پہ بھی تانے رکھا

☆

ہمارا سونا ہی فٹ پاتھ کی بہار ہوا
جو چیز پہنی برنگِ جمال پہنی ہے

☆

جانے رہتا ہے کہاں اقبال ساجد ان دنوں ؟
رات دن رہتا ہے اس کے گھر کا دروازہ کھلا

☆

کوئی تلاش کرے یا کرے نہ اے ساجد
کہ ہم نے جیب سے گھر کا پتہ نکال دیا

☆

اب ساجد کی تنہائی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے آس پاس چلتے پھرتے کروڑوں انسانوں میں
خود کو بہت تنہا اور اجنبی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی وہ جنگ جو کرپٹ معاشرے کے ساتھ تھی
اس میں نہ صرف شدت آ گئی تھی بلکہ اس کا ایک رُخ اب اس کی اپنی ذات کی طرف بھی مُڑ گیا تھا۔
وہ کہتا ہے۔

میں خود سے لڑائی میں ہوں مصروف شب و روز
کیا جانیے کیوں ختم تصادم نہیں کرتا

☆

اک طرف حالات سے اور اک طرف دشمن سے جنگ
خود کو لڑنے کے لیے تیار بھی کرنا پڑا

ساجد کے ہاں معاشرتی بیگانگی اور تنہائی کا جو بے پناہ احساس ملتا ہے اس کا ایک پہلو تو کائناتی

ہتا ظر میں وہ ازلی و ابدی تنہائی ہے جو اہل فکر کو ہمیشہ بیقرار رکھتی ہے۔ مگر اس کے علاوہ اس کے دیگر بہت سے سوشل عوامل بھی ہیں۔

تنہائی اور بیگانگی کا اس قسم کا شدید احساس جدید ترمشینی، صنعتی اور تجارتی سوسائٹی میں جنم لیتا ہے۔ کیونکہ مشینی معاشرے میں تخلیق کار پر مشین اور پیداوار کو فوقیت دی جاتی ہے۔ جدید نفسیات میں "کرداریت" کے بانیوں نے انسانی شرف اور شعور کو نظرانداز کرتے ہوئے سارا زور اس کی سوچ اور جسمانی اعمال کو کنٹرول کرنے پر صرف کیا۔ انسانی فکر کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے انہوں نے انسان کو بھی ایک مشین کا درجہ دے دیا۔

مشین جس کا خوشی اور غم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا نہ ہی اُس کے دیگر مشینوں سے باہمی تعلقات ہوتے ہیں۔ یوں "کرداریت" کے بانیوں نے مزدور کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھنے والے زر پرست سرمایہ داروں کو مزدور کے استحصال کے لیے زبردست "اخلاقی" بنیادیں فراہم کیں جس کے نتیجے میں پوری مغربی (سرمایہ دار) دنیا میں "کرداریت" کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔

یورپ وامریکہ میں مزدور کے اس نئے کردار کے تعین نے اس کے استحصال کا دروازہ کھول دیا۔ اب مزدور یا تخلیق کار مشین کے ساتھ مشین تصور ہونے لگا اور نتیجے میں اُس کا احساس مروت ختم ہوتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ وہ اپنے اردگرد سے بیگانہ ہونے لگا۔ صنعتی معاشرے میں تخلیق کار سارا دن محنت کرتا ہے وہ اپنی ساری ذہنی وجسمانی قوتیں پیدوار کے لیے صرف کر دیتا ہے مگر شام کو اس کے "دستِ دولت آفریں" پر چند سکے یوں رکھ دیے جاتے ہیں جیسے وہ محنت کار نہیں کوئی فقیر ہو؟۔ ایسے میں تخلیق کار اپنی محنت میں خوشی محسوس کرنے کی بجائے اُلٹا اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس پر یہ ستم کہ اس کے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی مصنوعات اس کی اپنی روزمرہ زندگی میں داخل نہیں ہو پاتیں بلکہ ایک زبردست حریف کی طرح اس کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسے میں محنت کار یا تخلیق کار کے دل میں مشین اور مصنوعات کے لیے نفرت کا احساس اُبھرتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کام نہیں کر رہا بلکہ اپنی تخلیقی قوت کو فروخت کر رہا ہے۔ یہیں سے محنت کار کے دل میں سرمایہ دار،

مشین اور اپنی ہی تخلیق کردہ اشیاء کے خلاف نفرت کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد اور پھر پورے معاشرے کے بارے میں اجنبیت اور بیگانگی کا رویّہ جنم لیتا ہے۔اس معاشرتی تنہائی، اکتاہٹ اور بیگانگی کے حوالے سے عظیم مفکر کارل مارکس لکھتا ہے۔

''بشر کی نوعی خصوصیت جو اُسے دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے اُس کا با ارادہ اور شعوری تخلیقی عمل ہے۔تخلیق ذات، تحفظ ذات، تجدید ذات اور تزئین ذات کی خاطر۔لیکن معاشرے میں طبقے پیدا ہو جانے کے باعث جب بادشاہ اور رعایا، آقا اور غلام، حاکم و محکوم، زمیندار اور کاشتکار کی تفریق پیدا ہونے لگی تو بشر کی یہ نوعی خصوصیت مجروح ہو گئی۔تخلیقی عمل تو جاری رہا اور محنت کرنے والے بدستور اشیاء پیدا کرتے رہے مگر ان کی محنت کی پیداوار میں اغیار بھی حصے دار بن گئے۔اس طرح بیگانگی کے جراثیم معاشرے کے جسد میں داخل ہو گئے۔۔۔۔۔۔

مگر جاگیرداری نظام کا موازنہ، خالص بیگانگی کے حوالے سے، اگر سرمایہ داری نظام سے کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جاگیرداری نظام میں حالات اتنے ناگفتہ بہ نہیں تھے۔کاشت کار کی محنت کے بڑے حصے پر زمین کا مالک، ریاست اور جاگیردار وغیرہ، بے شک قبضہ کر لیتا تھا اور اس کے مظالم اور ناجائز مطالبات کی بھی حد اور انتہا نہ تھی۔اس کے باوصف کاشتکار اپنے پیداواری عمل میں بڑی حد تک آزاد ہوتا تھا۔اس کے آلات و اوزار، مویشی اور مکان اس کی اپنی ملکیت تھے اور وہ ان چیزوں سے، اپنے بال بچوں سے بھی زیادہ محبت کرتا تھا۔پیار کے اس رشتے میں اس احساس بیگانگی کا گذر ہونا مشکل تھا۔کوئی اس سے یہ پوچھنے والا نہ تھا کہ تم کھیت پر کب گئے اور کب لوٹے اور تم نے کونسی فصل بوئی؟ یہ سارے کام وہ اپنی مرضی سے کرتا تھا اور کوئی دخل دینے والا تھا اور نہ باز پُرس کرنے والا۔ان کاموں میں اس کے گھر والے اور گاؤں والے بھی شریک ہوتے تھے۔محنت کی پیداوار پر غیروں کا تصرّف اس کی آزادانہ اور خود مختار زندگی پر اگر اثر انداز ہوتا تھا تو وہ اس کو نوشتۂ

تقدیر سمجھ کر قبول کر لیتا تھا۔ البتہ جب پانی سر سے اونچا ہونے لگتا تھا تو وہ بغاوت
کر دیتا تھا۔۔۔۔۔۔یہی حال کاشتکاروں اور ہنرمندوں ۔۔۔ ۔ بڑھئی ، لوہار،
پارچہ باف وغیرہ کا تھا۔ ان کے آلات واوزار اور کارگاہیں عموماً اپنی ہوتی تھیں جو
سامان وہ تیار کرتے تھے وہ اپنے اور گاؤں والوں کے ذاتی استعمال کے لیے ہوتا
تھا۔ وہ لوگ اپنا مال فروخت بھی کرتے تھے یا ان کا تبادلہ کرتے تھے تو ضرورت کی
دوسری چیزیں حاصل کرنے کی غرض سے۔ انہیں یہ احساس کبھی نہیں ستاتا تھا کہ وہ
دوسروں کے لیے محنت کر رہے ہیں اور ان کی پیداوار دوسروں کی ملکیت ہے۔
اس کے برعکس بیگانگی کا احساس سرمایہ زدہ معاشرے کی رگوں میں زہر کی طرح
سرایت کر گیا ہے۔ ذرائع پیدوار اور آلات پیداوار (فیکٹریاں، ملیں، کارخانے،
بنک، اشیاءِ خام کے ذخائر) سب ایک مخصوص طبقے کی ملکیت بن گئے ہیں اور محنت
کش طبقہ اپنی محنت اور قوت کو اس طبقے کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور ہے۔ پہلے
آلات واوزار اس کی مرضی کے تابع تھے اب اس کو آلات واوزار کے اشاروں پر
چلنا پڑتا ہے۔ وہ مشین کا پرزہ بن گیا ہے۔ اس کو اب اپنی محنت پر اختیار ہے اور نہ
محنت کی پیدوار سے کوئی سروکار۔ ہر شئے اس کے لیے غیر بلکہ اس کی ذات کی
حریف ہے۔ وہ فیکٹری، مل اور دفتر سے یوں نکلتا ہے جیسے قیدی قید خانے سے نکلتے
ہیں۔"(31)

کارل مارکس کے پیش کردہ تجزیے کے مطابق اس قسم کے ماحول میں انسان، انسانوں سے
کٹ کر جزیروں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ سوسائٹی کی اساس باہمی
تعاون کی بجائے Competition اور مسابقت پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ ہر پیشے اور طبقے کا
فرد مقابلے کے مرض میں مبتلا ہے اور دوسروں کو اپنا حریف خیال کرتا ہے۔ وہ دوسروں کو پچھاڑ
کر آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ اپنی کامیابی کی خاطر دوسروں کو شکست دے کر تسکین محسوس
کرتا ہے۔ آج کے انسان کی زندگی کا واحد مقصد اشیاء کا جمع کرنا رہ گیا ہے۔ اسے کتاب،

فنونِ لطیفہ اور سوشل ورک سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، وہ منزل کی دُھن میں کامیابی کی شاہراہ پر اکیلا بھاگا چلا جارہا ہے۔ اس دوڑ میں دوسروں کو کہنی مار کر یا دھکا دے کر آگے نکل جانے والوں کو کامیاب انسان سمجھا جاتا ہے اور دوسروں کے حقوق اور مفادات کو روند کر ترقی کی چوٹی پر پہنچنے والوں کی عزت کی جاتی ہے بلکہ دولت، عزت اور کامیابی مترادفات بن چکے ہیں۔ ایسے خودغرض ماحول میں انسان اگر تنہائی محسوس نہ کرے اور دوسرے لوگ اسے حریف نظر نہ آئیں تو بڑی حیرت کی بات ہوگی؟

سرمایہ دار صنعتی معاشرے میں ہر طرف پھیلی بیگانگی اور تنہائی کی بنیادیں تلاش کرتے ہوئے کارل مارکس لکھتا ہے۔

''آیئے ہم ایک حقیقی معاشی امر واقعہ سے رجوع کریں۔ مزدور جتنی زیادہ دولت پیدا کرتا ہے، جتنی زیادہ اس کی پیداواری صلاحیت اور قوت وسعت اختیار کرتی ہے اتنا ہی زیادہ وہ مفلس ہوتا جاتا ہے۔ مزدور جتنی زیادہ اشیائے تجارت تخلیق کرتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ خود مسلسل ارزاں ہونے والی تجارتی جنس بن جاتا ہے۔ جس رفتار سے اشیاء کی دنیا کی قدر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اسی نسبت سے انسان کی دنیا کی بے قدری بڑھتی جاتی ہے۔ محنت صرف اشیائے تجارت ہی پیدا کرتی ہے اور یہ عمل اسی تناسب سے ہوتا ہے جس سے وہ عمومی اشیائے تجارت کو پیدا کررہی ہوتی ہے۔(32)

تجارتی اور صنعتی سوسائٹی میں تخلیق کار اور مشین کی یہ کشمکش اسے ہر سمت اور ہر تعلق سے بیگانہ بنا دیتی ہے۔ شروع شروع میں تو انسان اپنے اردگرد سے بیگانگی اور اجنبیت محسوس کرتا ہے اور پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ انسان اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہوجاتا ہے اور پوری سوسائٹی میں محبت اور درد کے رشتے ٹوٹنے لگتے ہیں اور انسان اپنی ذات کے اندر سمٹنا شروع ہوجاتا ہے۔ ایسے میں انسان اپنی ذات اور اردگرد سے فرار حاصل کرنے کے لیے بہت سی علتوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

کارل مارکس کے اس تجزیے کو اگر ہم اقبال ساجد کی شاعری اور اس کے عہد پر منطبق کریں تو ہمیں اس کی ذات اور شاعری میں پائے جانے والے بے پناہ احساسِ اجنبیت و تنہائی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

بظاہر ہمارا معاشرہ زرعی ہے اور صدیوں سے یہاں فیوڈل اخلاقیات و روایات رائج ہیں۔ اگرچہ صنعتی ترقی کی شرح انتہائی کم ہے مگر یہاں صنعتی کلچر بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ دو دہائیوں سے میڈیا کا کردار بہت موثر اور وسیع ہو گیا ہے۔ مختلف براعظموں اور قوموں کے درمیان جغرافیائی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی بیریئر ٹوٹ گئے ہیں اور ہماری سوسائٹی میں انڈسٹری کی بجائے انڈسٹریل کلچر نے فلموں، ڈراموں، کمپیوٹر، ڈش انٹینا، انٹرنیٹ، فیکس، ڈاکومنٹری رسائل اور دیگر نشریات کے ذریعے ہم پر یلغار کر رکھی ہے۔ نتیجۃً ہماری سوسائٹی پوری طرح صنعتی نہ ہونے کے باوجود صنعتی کلچر کی زد میں ہے۔ اب تو ہمارے بڑے شہروں کا یہ حال ہے کہ لوگ کئی کئی سالوں تک ایک دوسرے کے ہمسائے میں رہنے کے باوجود ایک دوسرا کا نام تک نہیں جانتے۔ اس اجنبیت، تنہائی اور بیگانگی نے معاشرے کے باہمی اور اجتماعی رشتوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اب ہمارے شہر، شہر کی بجائے اجنبی لوگوں کے جزیرے لگتے ہیں۔ اقبال ساجد کا بیشتر وقت چونکہ لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں بسر ہوا تھا۔ لہٰذا اس کی شاعری میں ماڈرن انڈسٹریل کلچر اور اس کی اچھی بری قدریں جگہ جگہ اظہار کرتی ہیں۔

ایسے گھر میں رہ رہا ہوں دیکھ لے بے شک کوئی
جس کے دروازے کی قسمت میں نہیں دستک کوئی

☆

چل پڑے تو ہو لیے اقبال ساجد اپنے ساتھ
تھک گئے تو اپنے ہی سائے میں ستانے لگے

☆

جانے رہتا ہے کہاں اقبال ساجد ان دنوں
رات دن رہتا ہے اس کے گھر کا دروازہ کھلا

☆

رات فٹ پاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اس کا بستر بھی کیا، سر پہ بھی تانے رکھا

☆

ہے سفر درپیش تو پرچھائیں کی انگلی پکڑ
راہ میں تنہائی کے احساس سے پاگل نہ ہو

مانا کہ آخری دنوں میں وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں رہتا تھا، شراب نوشی کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا، سماجی سطح پر اسے شدید نفرت کا سامنا تھا اور اس کی حالت اُسی کے اس شعر جیسی تھی۔

کیا جانیے کیا بات ہے اک عمر سے ساجدؔ
ویران ہے ٹوٹے ہوئے مرقد سے زیادہ

مگر اس حوصلہ شکن صورت حال کے باوجود بھی اس نے اندر سے اپنی ذات کو بکھرنے نہیں دیا اور اپنی ذات کی اکائی کو محفوظ رکھا۔ اگر اس کے اندر کی یہ اکائی بھی ٹوٹ جاتی تو اس کا شاعر ریزہ ریزہ ہو جاتا اور ہم وقت سے بہت پہلے ایک خوبصورت شاعر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کی اس وحدت کی طرف خود اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

حوصلہ قائم رکھا گھر کے دکھوں کے درمیاں
دل کا آئینہ کسی بھی حال میں ٹوٹا نہیں
کٹ گیا جسم مگر سائے تو محفوظ رہے
میرا شیرازہ بکھر کر بھی مثالی نکلا

جہاں تک اس کے دستِ سوال دراز کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں وہ خود کہتا ہے

ضرورت ہی لیے پھرتی ہے ہم کو دربدر ورنہ
ہم اُن میں سے نہیں جو جستجوئے زر میں رہتے ہیں

ہمارے ہاں لوگوں کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اقبال ساجد کو سماجی لحاظ سے ناکام اور گنہگار قرار دیتے ہوئے اس کے گناہوں اور جرائم کی ایک لمبی فہرست پیش کرتا ہے اور اسے کسی رعایت کا

مستحق نہیں سمجھتا۔ لیکن ذرا سی انسانی ہمدردی اور دردِ دل کے ساتھ تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ بظاہر جن برائیوں کا وہ مجموعہ تھا درحقیقت یہ ساجد کی ذات سے زیادہ اس کے عہد کی برائیاں اور کمزوریاں ہیں۔ جس عہد میں وہ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ یہ برائیاں تو اس کے زمانے کے ہر دوسرے انسان میں موجود تھیں پھر ساجد پر اتنے بڑے بڑے فتوے کیوں؟ اُس کا قصور محض اتنا ہے کہ اس نے اپنے ظاہر اور باطن کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رکھا بلکہ وہ جیسا تھا ویسا ہی نظر آنے کی کوشش کرتا تھا۔ جبکہ دیگر لوگ موقعہ محل اور کام کی نوعیت کے مطابق لباس اور چہرہ تبدیل کر لیتے ہیں۔

اقبال ساجد بظاہر مروجہ اخلاق کی نفی کر چکا تھا مگر پھر بھی اپنی غیر اخلاقی سرگرمیوں کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے

کیا کروں مجبور تھا حق چھیننے کے واسطے
غیر اخلاقی رویّہ مجھ کو اپنانا پڑا

ہمارے موجودہ سسٹم کی بنیادیں کرپشن اور ناانصافی پر استوار کی گئی ہیں، کوئی انسان خواہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، وہ اس سسٹم میں رہتے ہوئے کرپشن سے بچ نہیں سکتا۔ اُس کا کوئی کام جائز طریقے سے نہیں ہونے دیا جاتا تو بالآخر وہ اپنے جائز کاموں کے لیے بھی ناجائز ذرائع استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کے کرپٹ سسٹم میں نیکی اور دیانتداری گالی بن کر رہ جاتی ہے اور قانون و اخلاق شکنی کامیاب زندگی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے۔ ایسے میں اس قسم کے معاشرے میں ایک نئی اخلاقیات پیدا ہوتی ہے جو کِک بیکس، کمیشن، بلیک میلنگ اور قانون شکنی سے جنم لیتی ہے۔ اس قسم کی سوسائٹی میں اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنا قانون شکنی اور غیر اخلاقی حرکت شمار ہوتی ہے اور حقدار اپنا حق مانگ کر الٹا مجرم بن جاتا ہے۔ ساجد کا مندرجہ بالا شعر دراصل ہماری سوسائٹی کے کرپٹ سسٹم پر بہت بڑا طنز ہے۔

اقبال ساجد عمر کے آخری حصے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ اپنے آس پاس کے علاوہ

گھر سے بھی اُس کا تعلق تقریباً ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ناقص غذا، خطرناک بیماریوں اور علاج کی مناسب سہولتوں کے فقدان کے سبب وہ موت کا اشتہار دکھائی دیتا تھا۔

گردشِ خوں پر ہو جب گردشِ دوراں کا اثر
کیوں نہ ساجد تنِ لاغر میں تپ دق ٹھہرے

آخری دنوں میں تو موت لمحہ لمحہ اس پر نازل ہو رہی تھی۔ دوست احباب پکڑ کر اسے کسی ہسپتال میں داخل کرواتے اور اس کے قیمتی حریف اور "کلائنٹس" موت کو اس کے تعاقب میں دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہتے "اب کی بار وہ نہیں بچ سکے گا" لیکن وہ ہسپتال کے بستر سے اٹھ کر چپکے سے کسی مشاعرے میں پہنچ جاتا اور اپنے حریفوں کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا۔

جیؤں گا اپنی مرضی سے، مروں گا اپنی مرضی سے
مرے اپنے تسلط میں ہے موت اپنی حیات اپنی

آخری عمر میں ساجد کے اندر sadism کا رجحان بہت بڑھ گیا تھا۔ ماہرین نفسیات کے مطابق جب کوئی شخص اپنے اہداف (goals) کو حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو مایوسی اور ناکامی کی حالت میں بالعموم وہ تین طرح کے ردِعمل ظاہر کرتا ہے۔

1۔ رجعت پسندی (ماضی میں پناہ ڈھونڈنا) کا شکار ہو جاتا ہے۔

2۔ Compromising رویہ اپناتا ہے یعنی اصل چیز کی بجائے کم تر درجے کی چیز پر اکتفا کر لیتا ہے۔

3۔ Agression یا جارحیت پر اتر آتا ہے اور دوسروں کو قتل کرنے، تشدد، گھر کے برتنوں اور املاک کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور بیشتر مواقع پر اس تشدد کا رخ اس کی اپنی ذات کی طرف مڑ جاتا ہے اور وہ تمام تر ناکامیوں کا ذمہ دار اپنی ہی ذات کو ٹھہراتے ہوئے خودکشی کر لیتا ہے۔ اقبال ساجد کے ہاں Sadism کی تیسری شکل بہت واضح اور مضبوط ہے۔

دہائی دوں کہ کھلے ظلم سے بچائے مجھے
کوئی تو ہو مرے پنجے سے جو چھڑائے
میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغلِ اذیت پسند آئے مجھے
مرے ہی منہ کو مرا خون لگ چکا ہے یہاں
مرے سوا کوئی قاتل نظر نہ آئے مجھے

گھٹیا قسم کی شراب نوشی کے نتیجے میں وہ وقت سے بہت پہلے موت کی دہلیز پر جا پہنچا تھا۔ زندگی سے لا پروائی اور بے نیازی کے سبب زیست کے سارے رنگ ایک ایک کر کے اُس کی ذات سے اُڑے جا رہے تھے۔

اک طبیعت تھی سو وہ بھی لا اُبالی ہوگئی
ہائے یہ تصویر بھی رنگوں سے خالی ہوگئی
کُھل گئی مٹھی تو میرا ہاتھ خالی رہ گیا !!
مجھ میں جو روشن تھا اُس کی شکل کالی ہوگئی

موت گھٹیا قسم کی شراب کی شکل میں لمحہ لمحہ اس کی رگوں میں اُتر رہی تھی اور وہ اپنے ہی لہو میں انگلیاں ڈبو کر اپنی موت کا کتبہ لکھ رہا تھا۔

کس نے اپنے ہاتھ سے خود موت کا کتبہ لکھا ؟
کون اپنی قبر پر عبرت کا پتھر ہوگیا ؟

نقاد میتھو آرنلڈ نے ادب کو تنقیدِ حیات کا نام دے کر ادب اور زندگی کے درمیان ایک نہایت مضبوط رشتے کی نشاندہی کی تھی۔ ہم اقبال ساجد کے نظریۂ فن کو میتھو آرنلڈ کے نقطۂ نظر کے حوالے سے تنقیدِ حیات کہہ سکتے ہیں۔ وہ شعر کو محض جمالیاتی تسکین کا ذریعہ سمجھنے کی بجائے اس سے تنقیدِ حیات کا کام لیتا ہے۔ وہ شعر کو اصلاحِ معاشرہ کے لیے وقف کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک بالغ نظر نقاد کی طرح سماجی برائیوں، کمزوریوں اور ناہمواریوں سے پردہ اٹھاتا ہے اور ایک مُصلح

کی طرح سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ ہمارے عہد کی وہ تمام چھوٹی بڑی بُرائیاں جو سماج کے جسم کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں ساجدان کی نہایت ذمہ داری سے نشاندہی کرتا ہے۔ ایسی ایسی سماجی ناہمواریاں جن کی طرف عام انسان یا شاعر کی نظر تک نہیں جاتی، ساجدانہیں بھی اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بناتا ہے۔ اس کے شعری موضوعات کا ہماری روزمرّہ زندگی کے مسائل سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس نے جن مسائل کو چھیڑا ہے وہ اس عہد کے ہر دوسرے شخص کے مسائل ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں قاری کے لیے بہت زیادہ اپنائیت ہے۔

اقبال ساجد کی غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف خود وہ ایک عام انسان ہے بلکہ وہ عام آدمی کا شاعر بھی ہے۔ ہمارے ہاں ایسے وی آئی پی شعراء کی کمی نہیں جو گرم سوٹ پہن کر، فائیوسٹار ہوٹل میں بُوفے ڈنر کرنے کے بعد فٹ پاتھ پر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بھوکے پیاسے، بے لباس انسان پر نظم لکھتے ہیں۔ اور اس نظم کو پڑھنے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے وہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بول رہے ہوں؟ مگر ساجد جب رگوں میں خون منجمد کردینے والی راتوں میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اپنے لیے نظم کہتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بے یارو مددگار کروڑوں انسانوں کی کہانی کہہ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی اپنی ذات اور تخلیقی تجربے کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔

ساجد کے شعری موضوعات روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لے کر بڑے بڑے قومی اور عالمی حادثات تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ مثال کے طور پر عدم انصاف ہمارے معاشرے کا ایک اہم مسئلہ بلکہ المیہ ہے۔ حضرت علیؑ نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا ہے کہ "حکومت کفر سے برقرار رہ سکتی ہے مگر ظلم سے نہیں"

یعنی حکمران کافر ہے مگر انصاف پسند ہے وہ دیر تک حکمرانی پر فائز رہ سکتا ہے جبکہ مومن ہے لیکن ظلم کرتا ہے تو اس کے حقِ حکمرانی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ گویا اچھے معاشرے ظلم سے نہیں بلکہ سماجی و معاشی انصاف کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ جبکہ ہماری سوسائٹی کا عدل کے حوالے

سے یہ عالم ہے کہ قاتل اور مقتول دونوں انصاف کے حصول کے لیے رقم خرچ کرنے پر مجبور ہیں ۔ بظاہر عدلیہ آزاد ہے مگر حالت یہ ہے کہ مقتدر حلقے عدلیہ پر "لشکر کشی" کرنے کے بعد بھی "باعزت" بری ہو جاتے ہیں۔ اور آج کل وہی عدلیہ کی آزادی کے چیمپئن بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف عدلیہ بھی بعض اوقات نظریہ ضرورت کے تحت ایسے فیصلے سُناتی ہے کہ اگر یہ فیصلے نہ ہوتے تو ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی؟ اقبال ساجد ایک عادلانہ معاشرے کا خواب دیکھتا ہے اسے یقین ہے کہ کوئی سوسائٹی عدل و انصاف کا کڑا معیار قائم کیے بغیر انسانی تہذیب اور ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ عدل کی راہ میں حائل رکاوٹوں پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

تفتیش اپنے ہاتھ میں لے اپنے قتل کی
خود ہی تلاش شہر میں جائے وقوع کر

☆

ظالم معاشرے کی صفائی میں کچھ نہ کہہ
قاتل کے حق میں دے نہ شہادت کرائے پر

ہماری آج کی سوسائٹی میں بڑھتی ہوئی آبادی اور جنگل کی طرح پھیلتے ہوئے شہروں میں رہائش کا مسئلہ کس قدر پیچیدگی اور سنگینی اختیار کر چکا ہے۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ۔ چھوٹے چھوٹے اور تنگ و تاریک گھروں میں کئی کئی خاندان آباد ہیں۔ جس کے نتیجے میں بے شمار سماجی، ماحولیاتی اور انسانی مسائل جنم لے رہے ہیں ۔ زندگی کی بیشتر سہولیات اور مراعات بڑے بڑے شہروں تک محدود کر دینے کی روش کے نتیجے میں دیہات سے شہروں کی طرف آبادی کی منتقلی کے رجحان میں زبردست اضافہ ہوا ہے جس سے شہر 'جنگل' کا روپ اختیار کرنے لگے ہیں۔ دوسری طرف مالک مکان کی ہوسِ زر، خود غرضی اور غیر انسانی و غیر اخلاقی رویے کے سبب شہروں میں منتقل ہونے والے کرایہ دار بے پناہ مسائل کا شکار ہیں اور کرایہ داری کلچر نے اپنے گھر کا خواب ناممکن بنا دیا ہے۔

شہروں پر آبادی کے بے پناہ دباؤ کے باعث آباد اور زرخیز زمینیں، بغیر کسی پلاننگ کے دھڑا

دھڑ رہائشی مقاصد کے لیے استعمال میں لائی جارہی ہیں جس کے نتیجے میں کچھ عرصے بعد بالآخر صحرا اور بنجر زمین باقی بچ جائی گی اور انسانی آبادی کو قحط کا شدید خطرہ لاحق ہوگا؟ اقبال ساجد مستقبل میں اس مسئلے کو مزید پیچیدہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے خیال میں جب زمین پر شہر آباد کرنے کی گنجائش نہیں رہے گی تو انسان خلاء میں کالونیاں بنانے اور اسے کرائے پر اٹھانے پر مجبور ہو جائے گا۔

بھر جائیگی زمین کی صورت فضا بھی کل
اُٹھ جائیگی خلاء کی بھی وسعت کرائے پر

شاعر ایک انسان ہوتا ہے جو اپنے تجزیے کے زور پر مستقبل میں جھانکنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اقبال ساجد نے یہ شعر دو تین دہائیاں قبل کہا تھا مگر آج سائنسدان کلون سٹی کے منصوبے پر کام کا آغاز کر چکے ہیں اور دنیا کے اہم ممالک کے مشترکہ سرمائے سے خلاء میں بسائے جانے والے اس شہر کی تعمیر میں استعمال ہونے والے میٹریل کی پہلی فلائیٹ بھی خلاء میں پہنچ چکی ہے۔ شاید پیشگوئی کے اسی اسلوب نے شاعری کو پیغمبری کا جزو بنا دیا ہے۔

اقبال ساجد مختلف سماجی برائیوں پر تنقید کرتا ہے۔ اس وقت ہماری سوسائٹی میں ہوس زر کی ایسی دوڑ لگی ہوئی ہے جس میں ہر شخص دوسرے سے آگے نکل جانے کے لیے کوشاں ہے۔ وہ کسی بھی ذریعے سے دولت حاصل کرنا چاہتا ہے، بس دولت ہی ان کا مقصدِ حیات ہے، یہی اس کا خواب ہے، دولت کے حصول کی خاطر وہ شرفِ انسانی کو داؤ پر لگانے سے بھی باز نہیں آتا۔ اس سفر میں اس کے راستے میں روایات، اقدار، اخلاق، مذہب حتیٰ کہ انسانیت، جو بھی آئے وہ اسے روند کر گزر جاتا ہے۔ اقبال ساجد ہوسِ زر میں مبتلا شخص کو تنبیہ کرتا ہے۔

سائے کی طرح بڑھ نہ کبھی حد سے زیادہ
تھک جائے گا بھاگے گا اگر حد سے زیادہ

ہوسِ زر کی انفرادی دوڑ میں ملک و قوم کی ترقی کا ڈول ہمیشہ کی طرح کنویں میں لٹک رہا ہے اور اس راہ پر اٹھنے والا ہر قدم آگے کی بجائے پیچھے کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اس اجتماعی بے سمتی کی طرف ساجد نے اپنی شاعری میں بڑے لطیف اشارے کیے ہیں۔

اقبال ساجد کے نزدیک ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کا کوئی قومی ایجنڈا نہیں، کوئی منزل نہیں، کوئی خواب نہیں۔ نام نہاد رہنما لوگوں کو ایک قوم بنانے کے بجائے اپنے وقتی مفادات کے تحت ایک ہجوم میں بدلنے میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہر کوئی ملکی وسائل کو دیوالیہ ادارہ سمجھ کر لوٹ رہا ہے مگر آزادی کے لیے قربانیاں دینے والوں کے ہاتھ بدستور خالی ہیں۔ غریب عوام کے نام پر توہین آمیز شرائط پر قرضے لیے جا رہے ہیں مگر یہ قرضے ان پر کبھی خرچ نہیں ہوتے۔ قوم کے معصوموں کے مستقبل عالمی مالیاتی اداروں کے لاکرز میں رہن رکھ دیے گئے ہیں۔

شاہراہِ آزادی پر نصف صدی سے زائد عرصہ چلتے رہنے کے باوجود جہاں سے چلے تھے آج ایک بار پھر وہیں کھڑے ہیں۔ ہمارا مستقبل غیر یقینی اور پاؤں ماضی کی طرف ہیں۔ اقبال ساجد اس بے سمتی پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

جیسے ہر چہرے کی آنکھیں سر کے پیچھے آ گئیں
سب کے سب اُلٹے ہی قدموں سے سفر کرنے لگے

گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے سے ہماری قومی زندگی عجیب و غریب نشیب و فراز سے گزر رہی ہے۔ بار بار مارشل لاء کے نفاذ، سیاسی، معاشی اور سماجی ناانصافی نے لوگوں کی سوچوں کو علاقائی، لسانی، انفرادی، گروہی اور فرقہ وارانہ حدوں تک محدود کر دیا ہے۔ لوگوں میں صبر اور برداشت کا فقدان اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر قانون اور اخلاق کی دھجیاں اُڑانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اسی قومی اور سماجی انتشار کی چند خوبصورت تصویر ملاحظہ کیجئے۔

بڑھ گیا ہے اس قدر اب سُرخرو ہونے کا شوق
لوگ اپنے خون سے جسموں کو تر کرنے لگے

☆

آباد ہوئے جب سے یہاں تنگ نظر لوگ
اس شہر نے ماحول کشادہ نہیں پہنا

☆

چپ کس لیے ہے اینٹ کا پتھر سے دے جواب
حق چاہیے تو میان سے شمشیر کھینچ لے

☆

میں آئینہ بنوں گا تو پتھر اٹھائے گا
اک دن کھلی سڑک پہ یہ نوبت بھی آئے گی
وہی میں نے بھی کیا جو مرے دل میں آیا
اور اُس نے بھی کوئی بات نہ مانی میری

اقبال ساجد کی غزل میں اس کے عہد کا سیاسی شعور ایک طاقتور رو کے طور پر ہر طرف دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ آج کے جدید عہد میں سیاسی اعتبار سے نابالغ شاعر پورے طور پر اپنے عہد اور لوگوں کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ چونکہ آج سیاست اور سیاسی ادارے ایک طاقتور عمل کے طور پر نہ صرف معاشرے میں موجود ہیں بلکہ کوئی انسان ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ سیاسی عمل اور سیاسی فیصلے ہی تو ہیں جنہوں نے اس عہد کے انسان کو مقامی اور عالمی سطح پر سیاسی شکنجوں میں جکڑ رکھا ہے؟

ہمارے ہاں پبلک مقامات پر اور دفتروں میں یہ سلوگن دیکھنے کو ملتا ہے کہ "یہاں سیاسی گفتگو سے پرہیز کریں" مگر اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا سیاسی عمل میں دلچسپی نہ لینے سے ہم بڑے سیاسی فیصلوں اور ان کے انسان دشمن نتائج سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کیوں نہ صحت مند سیاسی عمل میں حصہ لیتے ہوئے حکمرانوں کے انسان دشمن سیاسی فیصلوں اور توہین آمیز معاہدوں پر دستخط کرنے سے انہیں روکا جائے؟ سیاسی شعور دراصل کسی بھی سوسائٹی کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ خصوصاً اہلِ قلم کے لیے عصری و سیاسی شعور اس کے نظامِ فکر میں بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بصورتِ دیگر ادیب کا وہی حال ہوگا جو یورپ کے عظیم مفکر سارتر سے ملاقات کے دوران پاکستانی شاعر قیوم نظر کا ہوا تھا؟

اقبال ساجد کے نظامِ فکر میں سیاسی شعور کی جھلکیاں جا بجا دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کی زندگی

میں کم و بیش تین بار مارشل لاء نافذ ہوا۔ ایسی صورت حال میں جب ملک پر آمریت پنجے گاڑ لے، سیاسی آزادیاں سلب اور جمہوری حقوق پامال کر دیئے جائیں تو سماجی و سیاسی گھٹن کے نتیجے میں انسانی زندگی کی حالت کیا ہو گی؟ ان حالات کی طرف اقبال ساجد نے بڑے لطیف اشارے کیے ہیں۔

جہاں بھونچال بنیاد فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں
لہو سے جو اٹھائی تھیں وہ بنیادیں نہیں اپنی
یہی محسوس ہوتا ہے پرائے گھر میں رہتے ہیں
کبھی بیداریاں قسمت تھیں اب نیندیں مقدر ہیں
ہمارا کیا ہے ہم تو شہر خواب آور میں رہتے ہیں

ساجد نے اپنے اشعار میں ان چہروں سے پردہ کشائی بھی کی ہے جو کھاتے تو اس پاک دھرتی کا ہیں لیکن گیت کسی اور سرزمین کے گاتے ہیں۔ وطن میں رہتے ہوئے بھی ان کی فکری و جذباتی وابستگیاں کسی اور مٹی کے ساتھ ہیں۔ اور ان کے نظریاتی "قبلے" وطن سے باہر ہیں۔ اور وہ ذاتی خوابوں کی تعبیر کی دھن میں بیرونی ایجنڈوں پر عمل پیرا ہیں، یہی ہیں جو اس دیس کی جڑیں کھود رہے ہیں۔ بظاہر قوم کے درد میں مرے جا رہے ہیں مگر درحقیقت وہ عوام کے خلاف سازشوں میں شریک ہیں۔ اسی وطن دشمن روّیے پر طنز کرتے ہوئے اقبال ساجد کہتا ہے۔

بے گھر ہوں ہم بلا سے لیکن حصول زر میں
دیوار توڑتے ہیں انگنائی کاٹتے ہیں

وطن کے کے خلاف سازشوں کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے وہ دست بہ دُعا ہو کر کہتا ہے۔

خدا وہ دن نہ دکھلائے مری بستی کے لوگوں
جُدا جب سایۂ دیوار سے دیوار ہو جائے

انسانی آزادیوں پر پابندیوں سے کس طرح ظلم و ستم کا بازار گرم ہوا تقریر و تحریر پر کس طرح

پہرے بٹھائے گئے۔ یہ سارے مرقعے اس کی شاعری میں جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں۔

صبر کی بیل تو منڈھے چڑھ نہ سکی اے خدا
دہر میں دھوم دھام سے رسم چلی ہے جبر کی
کرب کا بحرِ بیکراں چاروں طرف ہے موجزن
گھر میں گھڑی مقیم ہے کب سے عذاب قبر کی
سزا تو ملنا تھی مجھ کو برہنہ لفظوں کی
زباں کے ساتھ لبوں کو رفو بھی ہونا تھا
وہ بولتا تھا مگر لب نہیں ہلاتا تھا
اشارہ کرتا تھا جنبش نہ تھی اشارے میں

اقبال ساجد اس ظالمانہ ماحول میں خاموشی اختیار کرنے کی بجائے لوگوں کو اس جبر کی صورتحال کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادیوں کا قائل ہے اس لیے وہ "صبر" اور "شکر" جیسے الفاظ کے ذریعے استحصال کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ لوگوں میں عصری شعور بانٹتا ہے اور مصلحت اور مفاہمت کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے۔

کاٹی نہیں تو اور بھی پھیلے گی شاخ جبر کی
صبر کی بات چھوڑ یے ہوتی ہے حد بھی صبر کی

☆

بتا اس دور میں اقبال ساجد کون نکلے گا؟
صداقت کا علم لے کر اگر تُو بھی نہیں نکلا

لیکن اس ظالمانہ ماحول میں قید لوگوں میں سے کوئی بھی نجات کے لیے شاعر کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں۔ ایک بھی قیدی انقلابی نہیں جو گھٹن، تاریکی اور نظر بندی سے بیزاری کا اظہار کرے۔ چنانچہ شاعر اس قحط الرجالی کی طرف داستانی انداز میں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

غار سے سنگ ہٹایا تو وہ خالی نکلا
کسی قیدی کا نہ کردار مثالی نکلا

ساجد اِس غیر منصفانہ سوسائٹی کی مکمل تطہیر کے لیے ایک ہمہ گیر انقلاب کا آرزومند ہے مگر صدیوں سے مراعات یافتہ طبقہ، ظالمانہ نظام اور اس کے نمائندوں کے خلاف بڑھتے ہوئے عوامی غم و غصے کے پیش نظر پورے نظام کی بجائے محض چہرے بدل دیتا ہے۔ تاکہ اس کی مراعات برقرار رہ سکیں اور یوں سادہ لوح عوام اور غیر مخلص راہنماؤں کے باعث تبدیلی کی ہر کوشش کو انقلاب کی بجائے ''سٹیٹس کو'' سے بدل جاتا ہے۔

اس ظالم سسٹم کے خلاف اگر کوئی بغاوت سر اٹھاتی بھی ہے تو غیر منظم اور کمزور ہونے کے باعث کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پاتی۔ لہٰذا شاعر اس کوشش کی ناکامی کی وجوہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

بھیک میں لے کر جرأتیں آئے تو پاؤں جھڑ گئے
پھاند سکے نہ اس لیے لوگ فصیلِ جبر کی

اقبال ساجد کا عہد سماجی، تہذیبی سیاسی اور فکری اعتبار سے بڑا ہی پُر آشوب تھا۔ اور اس نے اپنے زمانے کے عصری آشوب و انتشار کو اجاگر کرنے کے لیے ایسی مکمل تصویریں پیش کی ہیں کہ اس کی غزل میں ''شہر آشوب'' کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں بلکہ بعض غزلیں تو غزلوں سے زیادہ کسی خوبصورت شہر آشوب کا درجہ رکھتی ہیں۔

نازک نظر پہ بارِ یہ نازک سماں ہے آج
پانی پہ عکسِ شاخ پہ پتا گراں ہے آج

☆

باندھ دے شاخوں سے تُو مٹی کے پھل کاغذ کے
یہ تقاضا راہ میں اُجڑے شجر کرنے لگے
اب پڑھے لکھے بھی ساجد آ کے بیکاری سے تنگ

شب کو دیواروں پر چسپاں پوسٹر کرنے لگے

☆

باہر سے دیکھئے تو بدن ہیں ہرے بھرے
لیکن لہو کا کال ہے اندر پڑا ہوا
لوگ اکثر اپنے چہروں پر چڑھا لیتے ہیں خول
تو جسے سونا سمجھتا ہے کہیں پیتل نہ ہو

☆

اُگا نہ سبزہ تو اس نے اداس گھر کی منڈیر
پلاسٹک کی ہری بیل سے سجائی دیکھ

☆

سجائی جاتی ہے نیکی ثواب نمائش میں
بہائی جاتی ہے دریاؤں میں برائی دیکھ

اس قسم کے انتشار زدہ معاشرے میں جہاں بُھوک، افلاس، بیماری، خوف، تشدد، عدم انصاف، غیر محفوظیت، ظلم و جبر، جہالت، جنگ اور بے یقینی کی صورتِ حال ہو، جہاں لوگ دوسرے ممالک (امریکہ۔ یورپ وغیرہ) کو بڑی رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان ممالک سے جب کوئی مسافر یا سیاح آتا ہے تو تیسری دنیا کے لوگ اس سے اس کے ملک کی سیاسیات، تہذیب، لٹریچر، معاشیات، بزنس، انسانی حقوق، شخصی آزادیوں، پیداوار اور سرمایہ دار اور مزدور کے باہمی تعلقات کے حوالے سے طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ ساجد نے اپنی ایک غزل کے ذریعے اسی قسم کے بہت سے سوالات اٹھائے ہیں جس سے تیسری دنیا کے انسان کی بے چینی اور عدم اطمینان کا اظہار ہوتا ہے۔

سُنا احوال تیرے شہر کے آثار کیسے ہیں؟
مکین کیسے ہیں اس کے اور درو دیوار کیسے ہیں؟

جہاں رہتا ہے تُو اس خاک کی تاثیر کیسی ہے؟
پھلوں کا ذائقہ کیسا ہے اور اشجار کیسے ہیں؟
اُبھر کر سامنے آتے ہیں یا چُھپتے ہیں نظروں سے
کہانی گھومتی ہے جن پہ وہ کردار کیسے ہیں؟
وہاں مزدور کی اُجرت ادھوری ہے کہ پوری ہے
مزاجاً او ر ذہناً کا رخانہ دار کیسے ہیں
تجھے احساسِ آزادی ہے یا خوفِ اسیری ہے؟
فضا کیسی ہے تیرے گھر کی پہرے دار کیسے ہیں؟
ترے چہرے سے ظاہر ہے بہت ہی مطمئن ہے تو
عبارت کہہ رہی ہے معنی و معیار کیسے ہیں
میں اپنے مرکز و محور سے کب کا کٹ چکا ساجد
کسی کو کیا بتاؤں ثابت و سیار کیسے ہیں

اقبال ساجد کے ہاں فطرت سے محبت کا شدید اور گہرا احساس پایا جاتا ہے۔ اگر چہ اس کی غزل کی لفظیات ہمارے عہد کی مرّوجہ غزل سے قدرے مختلف ہے لیکن اس کے باوجود ساجد کے ہاں فطرت سے دلچسپی اور محبت کے اظہار کے لیے بعض مخصوص الفاظ ملتے ہیں۔ فطرت میں اس کی دلچسپی دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس کے اندر اس قسم کی شاعری کرنے کے لیے کس قدر جوہر موجود تھا۔

بظاہر وہ زندگی میں بہت کھردرا نظر آتا تھا جیسے لطیف، نرم اور نازک اشیاء سے اُس کا دور کا تعلق بھی نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ باہر کی فطری دنیا سے جب اس کا تعلق ٹوٹا تو اس نے یہ سارے پھول، پھل، بُوٹے اور بیلیں اپنے اندر اگالی تھیں۔ وہ فطرت کے مختلف مظاہر کو نہ صرف خود دیکھتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے اپنے ہاں بصارت اور مشاہدے کا عمل تو تیز ہے ہی مگر وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو بھی فطرت کے مشاہدے کے

لیے اُبھارتا ہے۔

سحر شعاعوں میں شبنم پرو کے لائی دیکھ
اُٹھ آنکھ کھول کے منظر کی خوشنمائی دیکھ
اُلٹ دی شام کو سورج نے روشنی کی دوات
فضا میں پھیل گئی سرخ روشنائی دیکھ
سفید پھول مہکتے ہیں شب کی چادر پر!
ہوئی ہے نقرئی تاروں سے کیا کڑھائی دیکھ
اُلٹ رہی ہے صبا سرخ پتّیوں کے ورق
کلی کلی کی چمن میں گرہ کشائی دیکھ

☆

جلتا ہے روز شام کو گھاٹی کے اُس طرف
دن کا چراغ جھیل کے اندر پڑا ہوا

☆

تماشا ختم ہوا شام کے مداری کا
سنہری سانپ چھُپے رات کے پٹارے میں
رات جب گذری تو پھر صبح حنا رنگ ہوئی
آسماں جاگی ہوئی رات کی لالی نکلا

اپنی تمام تر معاشرتی بیزاری اور اکتاہٹ کے باوجود ساجد کا لہجہ کہیں کہیں بڑا اخلاقی اور حکیمانہ ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی میں ایک خاص طرح کی خوش سلیقگی اور مہذب پن کا قائل ہے۔

پھینک یوں پتھر کہ سطحِ آب بھی بوجھل نہ ہو
نقش بھی بن جائے اور دریا میں بھی ہلچل نہ ہو
کھول یوں مٹھی کہ ایک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک لمحہ کوئی اوجھل نہ ہو

پہلی سیڑھی پہ قدم رکھ آخری سیڑھی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں رائیگاں اک پل نہ ہو
کچھ دیر اور شاخ پہ رہنے دے صبر کر
پکنے دے پھل کو کھانے میں لذت بھی آئے گی
سائے کی طرح بڑھ نہ کبھی قد سے زیادہ
تھک جائے گا بھاگے گا اگر حد سے زیادہ
خواہش ہے بڑھائی کی تو اندر سے بڑا بن
کر ذہن کی بھی نشوونما قد سے زیادہ

ساجد کے اشعار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ پڑھنے والے کو فوراً یاد ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعض اشعار اور مصرعے تو ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور لوگ انہیں روزمرہ زندگی میں مختلف مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

ع۔ نیکیوں کے پھل نہیں لگتے بدی کے پیڑ پر
ع۔ دہر کے اندھے کنویں میں کس کے آوازہ لگا
ع۔ کیا ملا تجھ کو بتا اندھے سے لاٹھی چھین کر
ع۔ جو بھی سستا تھا وہی بک گیا مہنگا ہو کر
ع۔ جسے میں چاند سمجھتا تھا وہ جگنو بھی نہیں نکلا
ع۔ حوالے سے جو منوائے وہ سچائی نہیں ہوتی
ع۔ کھل گئی مٹھی تو میرا ہاتھ خالی رہ گیا
ع۔ کوئی میٹھے پھلوں کی آس میں کیوں تلخ دن کاٹے
ع۔ سجائی جاتی ہے نیکی ثواب درختوں پہ
ع۔ خواہش ہے بڑائی کی تو اندر سے بڑا بن

کسی بھی شاعر کے فن کو سمجھنے کے لیے عموماً دو پہلوؤں کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔

(۱)۔اس کا موضوعاتی مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ اس کے موضوعات کا پھیلاؤ کہاں تک ہے؟ یعنی کہ اس نے اپنے نظامِ فکر میں کن سوالوں کو اہمیت دی ہے اور اس کا تخلیق کردہ ادب ایک صحت مند سوسائٹی کی تشکیل میں کس قدر مددگار ثابت ہوا ہے؟ انسانی سماج کو درپیش مسائل میں اس کی دلچسپی کی نوعیت کیا ہے؟ اور انسان کی اجتماعی دانش میں اس نے کس قدر نئے افکار کا اضافہ کیا ہے؟ (۲) اس نے اپنے فکری مواد کو کس اسلوب میں قاری تک پہنچایا ہے؟ یعنی اس کا پیرائیہ اظہار کن عناصر سے مل کر تشکیل پاتا ہے؟

دنیا بھر کی جدید شاعری میں تصویر کاری کا رجحان بہت نمایاں ہے جدید شعراء نے اپنے عہد کے معاشرتی، تہذیبی اور فکری آشوب کو نمایاں کرنے کے لیے تصویر کاری سے خصوصی شغف کا اظہار کیا ہے۔ یہ شعراء چھوٹی چھوٹی تصویروں کے ذریعے اپنے عہد کے آشوب و انتشار کو واضح کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کے انگریزی ادب میں ایذرا پاؤنڈ اس رجحان سے بطور خاص دلچسپی لیتا نظر آتا ہے۔ وہ چینی اور جاپانی شاعری سے متاثر تھا۔ پاؤنڈ اور اس کے کچھ ساتھیوں نے اسے باقاعدہ تحریک کی شکل دی، جس سے دنیا بھر کی شاعری متاثر ہوئی۔ اسی تحریک کے تحت اردو شعراء نے بھی تصویر کاری یا شبیہ سازی سے گہرا اثر قبول کیا۔ اس حوالے سے ناصر کاظمی، شکیب جلالی، منیر نیازی، ظفر اقبال، جاوید شاہین، شہزاد احمد اور اقبال ساجد کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

(ناصر کاظمی)

آ کے گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

(شکیب جلالی)

کاغذ کے پھول سر پہ سجا کر چلی حیات
نکلی برونِ شہر تو بارش نے آلیا

(ظفر اقبال)

ابر کی اوٹ سے جب چاند ذرا سا نکلا
روشنی دیکھ کے گھر سے کوئی سایہ نکلا

(شہزاد احمد)

تصویر کاری کے حوالے سے اقبال ساجد کی آرٹ گیلری میں آ کر ایک طرح کی تازگی، تازہ کاری اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی ہر تصویر کے پیچھے کوئی نفسیاتی، سماجی یا روحانی واردات پوشیدہ ہوتی ہے اور ایک خاص قسم کا تحرک ان تصاویر میں نظر آتا ہے۔ یہ تصویریں زندگی کی قوت اور حرکت سے لبریز ہیں۔ شاعرانہ تصویروں میں موجود قوت اور حرکت کا براہِ راست تعلق شاعر کے مزاج سے ہوتا ہے۔ اگر کسی شاعر کا مزاج سرد اور غیر متحرک ہے تو اس کی شعری تصویریں بھی بے حرکت اور زندگی کی حرارت سے عاری نظر آئیں گی، اگر کوئی شاعر خوش گو ہے تو اسی لحاظ سے اس کی شعری تصویروں کے کردار مکالماتی انداز اختیار کریں گے، اگر کوئی شاعر زندگی سے مایوس یا بیگانہ ہوگا تو اس کی تصویریں بھی بے عمل اور نیم جان ہوں گی۔

اقبال ساجد کی تصویروں میں ایک خاص طرح کا تحرک، توانائی اور زندگی کا گہرا احساس ملتا ہے۔

موم کی سیڑھی پہ چڑھ کے چھو رہے تھے آفتاب
پھول سے چہروں کو یہ کوشش بہت مہنگی پڑی

جلتا ہے روز شام کو گھاٹی کے اُس طرف
دن کا چراغ جھیل کے اندر پڑا ہوا

☆

اُلٹ دی شام کو سورج نے روشنی کی دوات
فلک پہ پھیل گئی سرخ روشنائی دیکھ

سفید پھول مہکتے ہیں شب کی چادر پر
ہوئی ہے نقرئی تاروں سے کیا کڑھائی دیکھ
رات جب گذری تو پھر صبح حنا رنگ ہوئی
آسماں جاگی ہوئی رات کی لالی نکلا

اقبال ساجد کی ہر تصویر رنگا رنگ، متحرک، جاندار اور مکمل ہوتی ہے۔ وہ ان تصویروں کے ذریعے اپنے عہد کے انتشار و آشوب کو نہایت ہنرمندی سے اجاگر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح ہمیں اس کی تصویریں اجنبی اور نامانوس محسوس نہیں ہوتیں بلکہ انہیں دیکھ کر ایک طرح کی اپنائیت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اقبال ساجد کا کمال یہ ہے کہ وہ اجنبی تصویروں میں مانوس عنصر ڈال دیتا ہے جبکہ مانوس تصویروں میں حیرت کے عناصر شامل کر کے ایک پُر اسراری کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ شاعرانہ کمال بہت کم شعراء کے حصے میں آتا ہے۔ ساجد کے شعری پیکر ہماری روزمرہ زندگی اور اس کے مسائل سے براہِ راست تخلیق کیے گئے ہیں۔ مثلاً

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہراک گھر سے سوالی نکلا

☆

رات فٹ پاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اُس کا بستر بھی کیا سر پہ بھی تانے رکھا

☆

جانور کی کھال پہنی اور چلا پنجوں کے بل
بن گیا بہروپیا، بازار میں آنا پڑا

اسی طرح درج ذیل تصویروں کو دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ شاعر نے کس طرح ہماری تہذیبی اور فکری زندگی کے بحرانوں اور بنجر پن کو ان کے ذریعے کمال فنی چابک دستی سے نمایاں کیا ہے۔

لگا کے صحن میں کاغذ کے پھول خوش ہے بہت
وہ خلق ہاتھ میں پتھر اُٹھا کے لائی دیکھ
اُگا نہ سبزہ تو اُس نے اجاڑ گھر کی منڈیر
پلاسٹک کی ہری بیل سے سجائی دیکھ

☆

جیسے ہر چہرے کی آنکھیں سر کے پیچھے آ گئیں
سب کے سب اُلٹے ہی قدموں سے سفر کرنے لگے
باندھ دے شاخوں سے تُو کاغذ کے پھل، مٹی کے پھول
یہ تقاضا راہ میں اُجڑے شجر کرنے لگے

☆

چُپ چاپ گھر کے صحن میں فاقے بچھا دیے
روزی رساں سے ہم نے گلہ کچھ نہیں کیا

☆

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

جس طرح قدرت نے انسان کی تخلیق میں عناصر اربعہ (ہوا، پانی، آگ اور مٹی) سے کام لیا ہے اسی طرح ایک اچھا شاعر بھی اپنے شعری پیکروں کی تخلیق میں ان عناصر سے بھر پور استفادہ کرتا ہے تا کہ اس کی تصویروں میں حرکت اور زندگی کا احساس پیدا ہو۔

اقبال ساجد کی بیشتر تصویروں کا خمیر بھی عناصر اربعہ سے اٹھا ہے اور وہ اپنی تصاویر کو آگ، ہوا، پانی اور مٹی جیسے عناصر سے خوب برتا ہے۔ آیئے سب سے پہلے اس کی آگ والی تمثالیں دیکھتے ہیں۔

اتنی تصویریں جلیں سینے کے آتش داں میں
گھر کے روشندان کی لکڑی بھی کالی ہو گئی

☆

پتہ کیسے چلے دنیا کو قصرِ دل کے جلنے کا
دھوئیں کو راستہ ملتا نہیں باہر نکلنے کا

☆

جلتا ہے روز شام کو گھاٹی کے اُس طرف
دن کا چراغ جھیل کے اندر پڑا ہوا

پانی کی چند تصویریں بھی دیکھتے چلیے۔

پیاسے کے پاس رات سمندر پڑا ہوا
کروٹ بدل رہا تھا برابر پڑا ہوا
ہاتھوں پہ بہہ رہی ہے لکیروں کی آبجو
قسمت کا کھیت پھر بھی ہے بنجر پڑا ہوا

☆

موجیں اُچھل کے شور مچائیں کرن کی سمت
دریا دُہائی دے کہ مری کائی چھن گئی

☆

مانجھیوں کے گیت سن کر آگیا دریا کو جوش
ساحلوں پر رقص تیزی سے بھنور کرنے لگے
دہر کے اندھے کنویں میں کس کے آوازہ لگا
کوئی پتھر پھینک کر پانی کا اندازہ لگا

☆

پھینک یوں پتھر کہ سطحِ آب بھی بوجھل نہ ہو
نقش بھی بن جائے اور دریا میں بھی ہلچل نہ ہو

آگ اور پانی کے ساتھ ساتھ اقبال ساجد نے اپنے شعری پیکروں میں خاک سے بھی خصوصی

شغف کا اظہار کیا ہے۔

یہی کہ گردِ مسافت ہوا مقدر تھی
روا بھی ہم نے بڑی بے مثال پہنی ہے

☆

رات ٹٹ ہاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اُس کا بستر بھی کیا، سر پہ بھی تانے رکھا

☆

کئی برسوں کے بعد آخر فلک نیچے اُتر آیا
بہت اچھا لگا دھرتی پہ مہرو ماہ کا رہنا

☆

رہنے دو خلاؤں میں مری قبر نہ کھودو
ہے پیار مجھے خاک کی مسند سے زیادہ

☆

بجھتی ہے گر شعاعوں کی تحریر آنکھ میں
ساجد کتاب خاک کے ذرے پڑھا کرو

اب ذرا ہوا سے متعلق تمثالیں بھی دیکھتے چلیے لیکن ہوا ایسا عنصر ہے جس کے بارے میں اس نے سب سے کم رغبت کا اظہار کیا ہے۔

اُلٹ رہی ہے صبا سبز پتوں کے ورق
کلی کلی کی چمن میں گرہ کشائی دیکھ

الگ الگ تصویروں کے علاوہ شاعر بعض اوقات مرکب تصویریں بھی تخلیق کرتا ہے۔ ایسی صورت میں دو یا دو سے زائد تصویریں مل کر ایک بڑی تصویر کی تشکیل میں مدد دیتی ہیں۔ مرکب تصویر کی تخلیق میں مدد کرنے والے عناصر بعض اوقات بالکل متضاد ہوتے ہیں مگر بڑے شاعر کا

ایک کمال یہ بھی مانا گیا ہے کہ وہ مختلف تضادات کو اس طرح تخلیقی ہنر بخشتا ہے کہ وہ تضاد حل ہو جاتا ہے۔ مثلاً غالب کا یہ شعر دیکھئے۔

کٹے تو شب کہیں ، کاٹے تو سانپ کہلا وے
تمہی بتاؤ کہ یہ زلف ِ خم بہ خم کیا ہے ؟

اب ذرا اقبال ساجد کی چند مرکب تصویریں بھی ملاحظہ ہوں۔ یہ تصویریں مٹی اور پانی کے مشترکہ تخلیقی عمل سے وجود میں آتی ہیں۔

ہاتھوں پہ بہہ رہی ہے لکیروں کی آب جو
قسمت کا کھیت پھر بھی ہے بنجر پڑا ہوا

☆

دہر کے اندھے کنویں میں کس کے آوازہ لگا
کوئی پتھر پھینک کر پانی کا اندازہ لگا

اسی طرح آگ اور پانی کی مرکب تصاویر بھی ہیں۔

جلتا ہے روز شام کو کھائی کے اس طرف
دن کا چراغ جھیل کے اندر پڑا ہوا
رات پھر جلنے لگی ہر موج لکڑی کی طرح
چاند شعلہ بن گیا دریا کے دامن کے لیے

جس طرح اقبال ساجد نے اپنے شعری پیکروں کو عناصر اربعہ کے ذریعے توانائی اور زندگی بخشی اسی طرح اس نے انسانی حواس کے حوالے سے بھی تصویریں تخلیق کی ہیں۔ جن کے مطالعے سے قاری کے حواسِ خمسہ تسکین پاتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اس شعر میں مرزا نے دیکھنے اور سُننے کی حسیات سے خصوصی شغف کا اظہار کیا ہے۔ ساجد بھی

ایک ماہر نفسیات کی طرح اپنے قاری کی تمام حسیات (Sences) کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے۔ جبکہ ہمارے بہت سے جدید شعراء تصویریں تخلیق کرتے وقت اس قدر گہری شاعرانہ بصیرت کا خیال نہیں رکھتے۔ ساجد کی بیشتر تصاویر کا تعلق حسِ باصرہ سے ہے اور ویسے بھی دنیا بھر کی شاعری میں زیادہ تر تصویریں حسِ باصرہ ہی سے متعلق پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں شاعر کی قوتِ مشاہدہ جس قدر تیز اور گہری ہوگی اسی حساب سے اس کی تصویریں بھی رنگا رنگ اور جاندار ہوں گی اور اسی تناسب سے قاری کی آنکھوں کو تسکین اور تفریح میسر آئے گی۔ ساجد کی حسِ باصرہ سے متعلق تصویریں بڑی رنگا رنگ، متحرک اور جاندار ہوتی ہیں۔

چند مثالیں دیکھیے۔

سحر شعاعوں میں شبنم پرو کے لائی دیکھ
اُٹھ آنکھ کھول کے منظر کی خوشنمائی دیکھ

اُلٹ دی شام کو سورج نے روشنی کی دوات
فلک پہ پھیل گئی سرخ روشنائی دیکھ

سفید پھول مہکتے ہیں شب کی چادر پر
ہوئی ہے نقرئی تاروں سے کیا کڑھائی دیکھ

رات جب گذری تو پھر صبح حنا رنگ ہوئی
آسماں جاگی ہوئی رات کی لالی نکلا

☆

یہ خود ہی آسمان کی وسعت میں قید ہے
کیا دیکھتا ہے چاند کو چھت پہ پڑا ہوا

ایک ہی حس کے بارے میں تصویریں پیش کرتے کرتے ساجد اچانک کسی ماہر نفسیات کی طرح قاری کی کم ہوتی ہوئی دلچسپی کو بھانپتے ہوئے کسی دوسری حس سے متعلق تصویریں تخلیق کرنے لگتا ہے۔ تاکہ قاری کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے آرام کر سکیں۔ اب وہ قاری کی توجہ کا

رخ چیزوں کو دیکھنے کی بجائے آوازیں سننے کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اب وہ ایسی تصویریں تخلیق کرتا ہے جس سے قاری کے ذوقِ سماعت کی تسکین ہو۔

کیا سوچتا ہے یاد کا سورج طلوع کر
چوپال بھر چکی ہے کہانی شروع کر
دہر کے اندھے کنویں میں کس کے آوازہ لگا
کوئی پتھر پھینک کے پانی کا اندازہ لگا

☆

مانجھوں کے گیت سن کر آ گیا دریا کو جوش
ساحلوں پر رقص تیزی سے بھنور کرنے لگے

اور جب آوازوں کو سنتے سنتے قاری کے کان تھکنے لگیں تو شاعر اس کی توجہ کا رخ حسِ شامہ کی طرف موڑ دیتا ہے۔

صحن میں پھول پھول جسم، کھیل رہے ہیں ہر طرف
خوف نہیں ہے دھوپ کا، فکر نہیں ہے ابر کی
گھروں سے کس لیے یہ بھیڑ سڑکوں پر نکل آئی
ابھی تو بانٹنے وہ شخص خوشبو بھی نہیں نکلا

☆

دعا مانگو کہ پھر رنگ پہ پرندہ لوٹ کر آئے
چمن کے زرد پھولوں میں مہک بیدار ہو جائے

☆

باغ میں کل رات پھولوں کی حویلی لٹ گئی
چشمِ شبنم سے چُرا کر لے گیا خشبو کوئی

☆

سرخ لہو سے پہ پھلواڑی کرتا ہوں
میں لفظوں کی کھیتی باڑی کرتا ہوں

باصرہ، اور شامہ کی طرح لامسہ انسان کی اہم ترین حس ہے جو انسانی تعلقات میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ غالبؔ نے بطور خاص اس سے شغف کا اظہار کیا ہے وہ حسِ لامسہ کی تسکین کے لیے محبوب کے پاؤں دابنے اور پاؤں دھو کر پینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اب ذرا لامسہ سے متعلق اقبال ساجد کی چند تصویریں دیکھیے۔

باندھ دے شاخوں سے ڈُونٹی کے پھل، کاغذ کے پھول
یہ تقاضا راہ میں اُجڑے شجر کرنے لگے

☆

موم کی سیڑھی پہ چڑھ کے چُھو رہے تھے آفتاب
پھول سے چہروں کو یہ کوشش بہت مہنگی پڑی

قاری جب چیزوں کو چُھو کر دیکھ چکتا ہے تو اب اس کی حسِ ذائقہ اسے چیزوں کو چکھنے پر مائل کرتی ہے۔ لہٰذا ساجد اپنے قاری کی اس خواہش کا بھی پورا احترام کرتا ہے۔

کچھ دیر اور شاخ پہ رہنے دے صبر کر
پکنے دے پھل کو کھانے میں لذت بھی آئے گی

ع۔ کوئی میٹھے پھلوں کی آس میں کیوں تلخ دن کاٹے؟

ع۔ نیکیوں کے پھل نہیں لگتے بدی کے پیڑ پر

اس طرح ساجد کی تصویریں قاری کی کسی ایک حس کو تسکین پہنچانے کی بجائے بیک وقت حواسِ خمسہ کی تفریح کا سامان مہیا کرتی ہیں۔

اقبال ساجد کی امیجری کے بعد جو چیز قاری کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کی نئی نئی علامات، نادر تشبیہات اور خوبصورت استعارات ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

"اقبال ساجد کی خوبی یہ ہے کہ بات کو براہِ راست قاری کے دل میں اتارنے کی

بجائے استعارے کا سہارہ لیتا ہے۔ وہ استعارہ اس تخلیقی انداز میں پیش کرتا ہے کہ پرانا مضمون بھی نیا نظر آتا ہے اور قاری ایک لطافت آمیز مسرت سے اقبال ساجد کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔''(33)

اقبال ساجد دراصل ایک ایسا شاعر ہے جس نے مضامین سے لے کر ردیف، قافیے، بحر، زمین، لہجے اور اظہار کی سطح پر غزل کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا۔ وہ بہت سے لکیر کے فقیر شاعروں کی طرح گھسے پٹے استعارے استعمال کرنے کی بجائے نئے استعارے تخلیق کرتا ہے۔ درحقیقت وہ ایک منفرد شاعر ہے جو کسی کے پیچھے چلنے کی بجائے آگے چلنا پسند کرتا ہے۔ اس نے اردو غزل کو بہت سے نئے اور تازہ استعارے دیے جو نئے ہونے کے باوجود اجنبی نہیں لگتے۔ کیونکہ اُس نے اپنے استعارے اردگرد پھیلی ہوئی روزمرّہ زندگی سے اخذ کیے ہیں۔

کیا لُطف اوڑھنے میں پُرانے لحاف کو
اُس کے بدن کی رُوئی سے گرمائی چھن گئی

رات فٹ پاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اُس کا بستر بھی کیا، سر پہ بھی تانے رکھا

☆

سورج ہوں چمکنے کا بھی حق چاہیے مجھ کو
میں کُہر میں لپٹا ہوں شفق چاہیے مجھ کو

ساجد نے غزل میں ہر جگہ نُدرت اور تازگی کا اظہار کیا اور اس کی انفرادیت کو بڑے بڑے شعراء اور نقادوں نے تسلیم کیا ہے۔ بلکہ ایک خاص قسم کی انفرادیت ہی ساجد کی غزل کی پہچان ہے۔ وہ معمولی بات کو اس زاویے سے دیکھتا ہے کہ وہ غیر معمولی نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی انفرادیت کے بارے میں عارف عبدالمتین اقطراز ہیں۔

''اقبال ساجد کی شاعری جرأتِ اظہار، ندرتِ خیال اور پاسداری روایت کی شاعری تھی۔ ان چیزوں کے امتزاج سے جو شاعری ظہور پذیر ہوئی وہ انفرادیت

کے قیمتی جوہر سے عبارت تھی۔ غزل کی فضا میں جن نئی آوازوں کو تادیر یاد رکھا جائے
گا ان میں سے ایک آواز اقبال ساجد کی تھی۔ مجھے امید ہے نئی غزل آئندہ جس
رُوپ کو اختیار کرے گی اس کی اساس ساجد کی غزل بھی فراہم کرے۔" (34)

اقبال ساجد کے استعارے اپنے بیشتر ہمعصروں سے مختلف ہیں اور نئے بھی۔ یہ نہایت واضح،
غیر مبہم اور بے پناہ تخلیقی ہوتے ہیں۔ چند اشعار دیکھتے چلیے۔

غربت کی تیز آگ پہ اکثر پکائی بھوک
خوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا

☆

چُپ چاپ گھر کے صحن میں فاقے بچھا دیے
روزی رساں سے ہم نے گلہ کچھ نہیں کیا
تماشا ختم ہوا دھوپ کے مداری کا
سنہری سانپ چھپے شام کے پٹارے میں
میں خلاؤں کو پہن کر بھی برہنہ ہو گیا
جستجو بیکار کی پیرا ہن تن کے لیے

☆

اُس آئینے میں دیکھنا حیرت بھی آئے گی
اک روز مجھ پہ اُس کی طبیعت بھی آئے گی

☆

فطرت نے جو لکھے ہیں وہ کتبے پڑھا کرو
مہنگی ہیں گر کتابیں تو چہرے پڑھا کرو

جس طرح بعض شعراء کے کچھ مخصوص استعارے ہوتے ہیں جن سے ان کا خصوصی لہجہ اور
اسلوب ترتیب پاتا ہے اسی طرح ساجد نے بھی بعض استعاروں کو تواتر سے برتا ہے وہ کبھی کبھی
ایک ہی استعارے کو نئی تازگی اور تخلیقی خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

ٹو نے جو لکھا ہے اس کو کوڑا کرکٹ ہی سمجھ
پیٹ کا دوزخ بُجھا سوچوں کا ایندھن بیچ کر

☆

کچھ برف برف لوگ پگھلنے کے واسطے
سورج سے چاہتے ہیں حرارت کرائے پر

☆

میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغل اذیت پسند آئے مجھے
آنکھ کے پتھر کو پھر اشکوں کی دیمک لگ گئی
عین ممکن ہے جگہ یہ سنگِ جادہ چھوڑ دے

☆

اتنی تصویریں جلیں سینے کے آتش دان میں
گھر کے روشن دان کی لکڑی بھی کالی ہوگئی

☆

طوق گردن میں پہنتا ہوں لہو کی دھار کا
خلق کو حیران ساجد زد بہ زد کرتا ہوں میں

☆

تو بھی اپنے جسم کے اندر ایندھن ڈال
میں بھی تیز لہو کی گاڑی کرتا ہوں

☆

یہ دل کا کوہِ نور کسی کی نگاہ میں
کل تک تو قیمتی تھا مگر رائیگاں ہے آج

☆

آیئے اب ساجد کی بعض مخصوص علامتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس نے استعاروں کی طرح

علامتیں تخلیق کرنے میں بھی بڑی تازگی، فنی پختگی اور تخلیقی سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ وہ اپنی علامتیں براہِ راست اپنے ماحول اور عصری زندگی سے اخذ کرتا ہے۔ اس نے ہماری سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے بہت سے رنگوں، معاشرتی کمزوریوں اور ناہمواریوں کا رس نکال کر اپنی علامتوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا ہے۔ یہ علامتیں ہماری زندگی کے مختلف رویّوں اور رنگوں کی ترجمانی اور عکاسی کرتی ہیں۔

علامت سازی میں ساجد نے نہ صرف نئے پن کا ثبوت دیا بلکہ ان نئی علامتوں کے ساتھ لوگوں کے جذباتی و احساساتی ردِعمل کو بھی وابستہ کیا۔ یہ کام اگرچہ بہت مشکل تھا مگر ساجد کی جدّت پسند طبیعت نے اس چیلنج کو بھی پورا کر دکھایا۔ آیئے اس کی مخصوص علامتوں کو ان کے مخصوص سماجی و تہذیبی پس منظر میں رکھ کر مطالعہ کرتے ہیں۔

ساجد کی بہت سی علامتوں میں سے گھر ایک مرکزی علامت ہے جو اندرونی و بیرونی طور پر انتشار کا شکار ہے۔ اس گھر کے باشندے ایک ہی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے بھی جزیروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کے درمیان خوشی، غم، ایثار و قربانی اور دکھ درد کے سارے رشتے منقطع ہو چکے ہیں۔ گھر کا ہر فرد اپنی خودغرضانہ خواہشات کی تکمیل کے لیے اس گھر کا ملبہ تک فروخت کرنے پر آمادہ ہے۔ اس گھر کا تعلق آس پاس کے تمام گھروں سے ٹوٹ چکا ہے اور اس کے باسی نہ صرف سماجی سطح پر مُفلسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں بلکہ وہ روحانی طور پر بھی کنگال ہو چکے ہیں۔ ساجد کا یہ گھر اُس کے اپنے گھر سے لے کر قومی اور پھر بین الاقوامی گھر کی توڑ پھوڑ، معاشی حالت، تنہائی اور انتشار کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے۔

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو، ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

☆

آ، بھنکار کی مانند گھروں سے نکل

کوئی بھی گھر نہ یہاں سانپ سے خالی نکلا
چڑھتے سورج نے پھر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

☆

لہو سے جو اٹھائی تھیں وہ بنیادیں نہیں اپنی
یہی محسوس ہوتا ہے پرائے گھر میں رہتے ہیں
جانے رہتا ہے کہاں اقبال ساجد ان دنوں
رات دن رہتا ہے اس کے گھر کا دروازہ کھلا
ایسے گھر میں رہ رہا ہوں دیکھ لے بے شک کوئی
جس کے دروازے کی قسمت میں نہیں دستک کوئی

☆

بے گھر ہوں ہم بلا سے لیکن حصولِ زر میں
دیوار توڑتے ہیں ، انگنائی کاٹتے ہیں

☆

اس حادثے سے بڑھ کر کیا حادثہ ہو ساجد
اپنے ہی گھر میں قیدِ تنہائی کاٹتے ہیں

☆

گھر سے ملتا جلتا استعارہ "شہر" ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کے اندر ساجد کا "گھر" واقع ہے جو انتشار، خود غرضی، تنہائی، اور تشدد اِس شہر کا مزاج ہے وہی سب کچھ اس شہر میں آباد ہر گھر کے اندر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس گھر اور شہر کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ اس شہر کا ہر محلّہ ایک جزیرہ اور ہر فرد ایک مسلّح لشکر ہے۔ کوچہ و بازار میں پھیلی آلودگی کے ڈانڈے ذہنی آلودگی سے جا ملتے ہیں۔ خوشحالی، خوشی، امن، برابری، انسان دوستی، شناخت، برداشت، آزادی، علم اور احترام اِس شہر سے

رخصت ہو چکے ہیں۔ اخلاقی اور تہذیبی طور پر کھنڈر ہو جانے والے اس شہر کی شکستہ دیوار پر بیٹھا اقبال ساجد اس شہرِ مرحوم کا مرثیہ بلکہ شہر آشوب لکھ رہا ہے۔ افراتفری، اجنبیت، تنہائی، انتشار، نفرت اور جہالت ہی اب اس شہر کی شناخت ہے۔

یہ "شہر" بھی ساجد کے "گھر" کی طرح صرف اس کا شہر نہیں بلکہ یہ بھی ہماری قومی بلکہ بین الاقوامی زندگی کے تمام جدید رجحانات اور رویوں کا احاطہ کرتا ہے۔ چند مثالیں۔

آباد ہوئے جب سے یہاں تنگ نظر لوگ
اس شہر نے ماحول کشادہ نہیں پہنا

☆

چڑھتے ہی دھوپ شہر کے کھل جائیں گے کواڑ
جسموں کا ریگزار روانی میں آئے گا

☆

غربت کی تیز آگ پہ اکثر پکائی بھوک
خوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا؟

☆

کبھی بیداریاں قسمت تھیں، اب نیندیں مقدر ہیں
ہمارا کیا ہے ہم تو شہرِ خواب آور میں رہتے ہیں

☆

شہر کے باغ میں ہوجائے ملاقات تو پھر
کون گلیوں میں رُکے، کون پسِ در ٹھہرے؟

☆

"سانپ" ساجد کی ایک اور اہم علامت ہے جسے وہ بیک وقت استحصالی گروہ، خوف، جنس اور دوستوں کے بھیس میں چھپے دشمنوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ استحصالی طبقہ سانپ کی طرح کمزور لوگوں کے حقوق اور مفادات کو مسلسل ڈس رہا ہے اور ان کی خود غرضی، فریب و مکاری کا زہر آہستہ آہستہ سوسائٹی کے جسم میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ سانپ کہیں طاقتور دشمنوں کے رُوپ میں

اور کہیں دوست نما دشمنوں کی صف میں منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ ویسے بھی قدیم میتھالوجی میں سانپ اور خزانے کا باہمی رشتہ بہت پرانا ہے۔ گویا سانپ خزانے یا دفینے پر اجارہ داری قائم کر کے بیٹھ جاتا ہے اور کسی کی شراکت کو قبول نہیں کرتا۔ آج تیسری دنیا کی غیر نمائندہ اور غیر مستحکم حکومتوں میں سانپ اور خزانے کا رشتہ ایک نئی معنویت کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ خود ہمارے ہاں سیاسی اژدھے قومی خزانے کے ارد گرد پھن پھیلائے بیٹھے ہیں اور غریب اور پسے ہوئے عوام بنیادی انسانی ضرورتوں کے لیے ترس رہے ہیں۔ یہ سانپ ملکی خزانے کو مالِ غنیمت کی طرح آپس میں بانٹ کر مقامی و غیر ملکی بنکوں میں منتقل کر رہے ہیں مگر قومی خزانے کو ان سانپوں کے چنگل سے آزاد کرانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ان سانپوں کو پچھاڑ کر یہ کارنامہ کر دکھاتا ہے تو بھی اس کے ثمرات عام آدمی تک نہیں پہنچ پاتے بلکہ ''تماشائی'' خزانے پر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں اور ''ماریہ'' کو مارنے والے ہاتھ خالی کے خالی رہ جاتے ہیں۔

ساجد اس کئی رُخے استحصال کی عکاسی یوں کرتا ہے۔

ٹھہرے ہیں زرو سیم کے حقدار تماشائی
اور ماریہ ہم نے دفینے سے نکالا

سانپ کی علامت کے حوالے سے مزید کچھ مثالیں دیکھیے۔

خون کا نشہ چڑھا تو جسم زہریلا ہوا
خواہشوں کے پانیوں میں سانپ لہرانے لگے

☆

آہ پھنکار کی مانند گھروں سے نکلی
کوئی بھی گھر نہ یہاں سانپ سے خالی نکلا

اس کے نزدیک ان سانپوں کے زہر سے بچنے کا ایک ہی تریاق ہے اور وہ ہے ماں کی دعا۔

خوف آیا نہیں سانپوں کے گھنے جنگل میں
مجھ کو محفوظ مری ماں کی دعا نے رکھا

☆

جب ماں کی دعا ساتھ ہے سانپوں کے نگر میں
ساجد میں حواس اپنے کبھی گم نہیں کرتا

☆

اقبال ساجد نے جس علامت کو سب سے زیادہ کثرت کے ساتھ استعمال کیا وہ خون یا لُہو کی علامت ہے۔ اس کے ہاں خون کی علامت کی کئی سطحیں ہیں۔ خون کہیں انقلاب یا تبدیلی کی علامت ہے تو کہیں زندگی کی۔ (اسی لیے بہت سی قدیم تہذیبوں میں انسانی قربانی رائج رہی ہے) خون کی علامت کہیں محنت اور جدو جہد کا مفہوم لیے ہوئے ہے اور کبھی کبھی شاعر خون کے ذریعے اپنے زمانے کے تشدد اور قتل و غارت گری کے رجحانات کو واضح کرتا ہے۔ اسی طرح خون کی علامت کا سماجی و تہذیبی پس منظر بھی ہے کہ ساجد نے قیام پاکستان کے وقت انسانی خون سے کھیلی جانے والی ہولی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کے بعد بھی ہمارے معاشرے میں انسانی خون کی ارزانی اب عام ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں دنیا بھر میں ہونے والی جنگیں، تشدد کی کاروائیاں، بم دھماکے، زمینی اور خلائی حادثے جن میں آئے روز انسانی خون بہتا ہے۔ شاید انہی ساری باتوں نے مل کر ساجد کی طبیعت پر گہرے اثرات مرتب کئے ہوں؟

لہٰذا اسی لیے اس کی غزل میں جگہ جگہ انسانی خون کے چھینٹے بکھرے نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بڑھ گیا ہے اس قدر اب سرخرو ہونے کا شوق
لوگ اپنے خون سے جسموں کو تر کرنے لگے

☆

وہ سطحِ برگ و چمن پھر سے ہو گئی رنگین
لہو سے سُرخ ہوئی ساحلوں کی کائی دیکھ

☆

مرے ہی منہ کو مرا خون لگ چکا ہے یہاں
مرے سوا کوئی قاتل نظر نہ آئے مجھے
طوق گردن میں پہنتا ہوں لہو کی دھار کا
خلق کو حیران ساجد زو بہ زو کرتا ہوں میں

☆

دُھت رہتا ہوں اپنے خون کے نشے میں
رقص خوشی سے پی کرتاڑی کرتا ہوں

☆

ہسپتالوں میں یہ کاروبار بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خون کا بیوپار بھی کرنا پڑا

''سورج'' خون کے بعد ساجد کی غزل کی دوسری بڑی علامت ہے۔سورج کو انسان کی فکری کائنات میں ہمیشہ ہی نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔زمانہ قدیم ہی سے کئی اقوام اور قبیلے بطور دیوتا سورج کی پوجا کرتے رہے ہیں۔زرعی معاشروں میں تو ویسے بھی دریا اور سورج بنیادی دیوتاؤں کے طور پر پوجے جاتے تھے، کیونکہ فصلوں کے بونے، پھلنے پھولنے اور پکنے میں دونوں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ستارہ پرست اقوام میں سورج کو روشنی اور زندگی بخشنے والا مانا جاتا ہے۔ستارہ پرست اقوام کے علاوہ سورج تقریباً ہر قوم کے شعروادب کا محبوب موضوع سمجھا جاتا ہے۔مصریوں نے اسے راع کا خطاب دیا، یونانیوں نے اسے ہیلیوس اور اہلِ روما نے اسے Sol کا نام دیا ہے۔

مذاہب عالم کے علماء کے مطابق دنیا کے بیشتر مذاہب کی جڑیں صابئیت اور مجوسیت میں ہیں۔یہودیوں، عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں نے رکوع وسجود انہی دو مذاہب سے لیے ہیں۔اسلام میں نمازوں کے اوقات کار کا تعلق بھی سورج کی گردش ہی سے ہے۔صابئیت میں تو سورج کی پوجا تیر اعظم اور خداوند شمس کے نام پر کی جاتی تھی اور زمین پر بعل اور مردوخ کے نام سے اس کے بت بنائے جاتے تھے۔حتیٰ کہ مجوسیت میں متھرا کو بھی بطور سورج دیوتا ہی پوجا جاتا ہے۔صابئین سورج کے گرد چکر لگانے والے سات ستاروں کی پرستش الگ الگ دیوتاؤں کے طور پر کرتے تھے۔وہ اپنے معبدوں کے اونچے میناروں پر بیٹھ کر ستاروں کی گردشوں کا حساب لگایا کرتے یہیں سے علم ہیت نے جنم لیا۔اسی طرح یہودیت میں سبت، عیسائیت میں سنیچر اور ہندوؤں میں اتوار کے ایام سورج ہی کے دنوں کے طور پر منائے جاتے ہیں۔

سورج کی پوجا نسبتاً پڑھی لکھی اقوام اور دانشور طبقوں میں مقبول رہی ہے۔ قبل مسیح کی معاصر اقوام میں سے یونان میں اپالو، روم میں ہرکولیس مصر میں ہورس، کارتھیج میں بعل اور ایران میں متھرا کی پوجا سورج دیوتا ہی کے طور پر ہوتی تھی۔ سورج کے بارے میں یہ تمام تصورات سائنس کے آغاز سے قبل کے ہیں۔ جبکہ آج انسان سورج کو دیوتا ماننے کی بجائے اس کی سائنسی تشریح پر پوری طرح قادر ہے۔ سورج ہماری زمین سے ایک سو پچاس ملین کلومیٹر دور ہونے کے باوجود ہماری زندگی سے انتہائی قریبی تعلق رکھتا ہے۔ زمین پر زندگی کی نمو اور اس کی بقا کا سارا دارومدار سورج ہی پر ہے۔ بے انتہا طاقتور بصری اور ریڈیو دوربینوں کی مدد سے اب سورج کی زندگی کے ہر مرحلے اور عہد کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ کہکشاؤں کے دامن میں ہمارے سورج جیسے کھربوں سورج مسلسل پیدا اور فنا ہو رہے ہیں۔ ان سورجوں کی پیدائش، بچپن، عہد جوانی، ادھیڑ عمری، بڑھاپے اور بالآخر فنا کے گھاٹ اترنے کے عمل کا براہ راست مطالعہ و مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ سورج کی تحقیقات کے لیے سائنس کی ایک نئی شاخ وجود میں آئی ہے جسے ہیلیو سیمالوجی کہتے ہیں۔ اس سائنس کا بنیادی مقصد سورج کے اندرون کو "سننا" ہے۔ اقبال ساجد کے ہاں سورج ایک کثیر الجہات علامت ہے۔ کہیں وہ زندگی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنیاں بانٹتا ہے تو کہیں فرد کے فنی و تخلیقی جوہر کی علامت ہے۔ بعض مقامات پر ساجد اسے جدوجہد اور انقلاب کے حوالے سے بھی استعمال کرتا ہے اور کہیں کہیں سورج ظلم کی علامت بھی بن جاتا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

رنگ آخر لے ہی آیا میری سوچوں کا جمود
برف کے سورج بلا کی دھوپ پھیلانے لگے

☆

جس میں بھرا تھا زہر وہ سورج زقو گیا
یہ غم نہیں کہ آنکھ سے بینائی چھن گئی

☆

سورج ہوں چمکنے کا بھی حق چاہیے مجھ کو

میں گھر میں لپٹا ہوں شفق چاہیے مجھ کو

☆

نکلیں چراغ ہاتھ میں لے کر گھروں سے لوگ
سورج کی راہ میں منزل ظلمت بھی آئے گی

☆

''چاند'' بھی ساجد کی خوبصورت علامتوں میں سے ایک خوبصورت علامت ہے۔ سورج کی طرح چاند نے بھی انسان کو زمانۂ قدیم سے اپنے سحر میں گرفتار کر رکھا ہے۔ ستارہ پرستی میں چاند کی پوجا بھی بطور دیوی کی جاتی رہی ہے۔

مصری دیوی آئسں، روم کی وینس، یونان کی افرودائتی، بابل کی عشتار، شام کی عشرتی، کنعان کی عشتور، مکہ کی عزیٰ، ایران کی اناہتا بعد ازاں ناہید اور ہند کی انا کی پوجا چاند کی دیوی کے طور پر کی جاتی تھی۔ مادرسری معاشرے میں مرد کی بجائے عورت کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اور اسی طرح مردوں میں ماں کے بعد ماموں کا درجہ ہوتا تھا۔ لہٰذا زمین اپنی پیداواری صلاحیت کے سبب جب ماتا (ماں) قرار پائی تو چاند اپنی پُراسرار خوبصورتی اور زمین سے قُرب کے باعث ماموں قرار دے دیا گیا۔

سورج کی طرح تمام قدیم اقوام کے نظامِ فکر میں چاند کو بھی خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک چاند دنیا بھر کے شعر و ادب میں مرکزی استعارے کے طور پر موجود ہے۔ آج بھی مائیں اپنے بچوں کو اور عاشق اپنے محبوب کو چاند سے تشبیہ دیتے نظر آتے ہیں۔ چاند کی جمالیاتی حیثیت ہمیشہ سے مسلّمہ رہی ہے مگر 1971 میں جب انسان اس کی بے آباد زمین پر اترا تو اس کے بارے میں صدیوں سے قائم طلسم ٹوٹ گیا۔ اب نئی تحقیق سے پتا چلا کہ بڑھیا کا ''چرخہ'' تو دراصل چاند کے سینے پر ایستادہ دس دس ہزار فٹ اونچے پہاڑ ہیں اور جگہ جگہ گہری گھاٹیاں اور طویل صحرا ہیں۔ چاند پر پانی، سبزہ اور ہوا ہے نہ ہی خوبصورت موسم اور پرندے۔ ہر طرف ایک گمبھیر خاموشی ہے اور ارضیاتی اور حیاتیاتی حوالے سے یہ ایک مکمل طور پر مُردہ سیارہ ہے۔ جہاں کسی حرکت اور آواز کا گزر تک نہیں ہوتا۔

انسان 1969-1972ء تک چاند کے چھ چکر لگا کر جان چکا ہے کہ وہاں بظاہر ایسی کوئی چیز نہیں جو ہمارے لیے باعث کشش ہو؟ بلکہ ان انکشافات کے بعد تو اصل سوال یہ ہے کہ ہم وہاں کیوں جائیں؟ چاند کے حوالے سے اچانک "صدمے" سے دوچار ہونے کے بعد اب ہم سنبھل چکے ہیں اور اب چاند کے بارے میں زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ اپنا رہے ہیں۔

بلکہ اس حوالے سے آج کا سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ چاند پر آباد ہونے کا انسانی خواب کب پورا ہوگا؟ خلائی ماہرین اس حوالے سے پرامید ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اکیسویں صدی کے اختتام تک انسان یہ محیر العقول کارنامہ بھی انجام دے چکے گا۔ بشرطیکہ اسلحے پر پچاس کھرب ڈالر سالانہ خرچ کرنے والے ممالک (اس رقم سے زمین کے سائز کے پانچ ویران سیاروں کو آباد کیا جا سکتا ہے) جنگ سے ہاتھ کھینچ کر یہ سرمایہ خلائی تسخیر کے لیے وقف کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ آج خلائی ماہرین چاند پر ایسی خلائی کالونیوں اور مصنوعی رہائش گاہوں کے منصوبے پر کام کر رہے ہیں جن کے اندر زمین جیسا ماحول قائم رکھا جائے گا۔ درحقیقت یہ رہائش گاہیں چاند اور زمین کے درمیان بیس کا کام دیں گی جہاں انسانوں کے ساتھ جانوروں، پرندوں اور پودوں کو بھی رکھا جا سکے گا۔

خلائی سائنس میں ہونے والی حیرت انگیز پیش رفت کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ نئی صدی کے اختتام تک انسان کا چاند پر بسنے کا خواب ضرور پورا ہو جائے گا اور ایک دن وہ لمحہ بھی آئے گا جب ایسا نظام چاند کے باشندوں کو زمین سے مکمل طور پر آزاد اور خودمختار کر دے گا۔ یہ تاریخ انسانی میں بالکل نیا موڑ ہوگا جس کا مطلب ہوگا کہ انسان کے پاس زمین کے علاوہ بھی ایک دوسری دنیا موجود ہے۔ کسی قدرتی حادثے یا انسان کی اپنے ہاتھوں مکمل تباہی کے نتیجے میں اس کے پاس ایسی دنیا موجود ہوگی جہاں زندگی (نوع انسانی) ایک یادگار کے طور پر باقی رہے گی بلکہ کسی اگلی تباہی کے آنے تک انسان کا علم، تاریخ اور کلچر محفوظ رہے گا؟

چاند اقبال ساجد کے ہاں بیک وقت روشنی، خوبصورتی، جذبہ، پاگل پن، محبت، نارسائی اور ٹھنڈک کی علامت ہے۔ چاند کی علامت اس کے ہاں اس لیے بےحد اہمیت اختیار کر جاتی ہے

کہ اس کے ذریعے بظاہر کھردرے اور بیزار نظر آنے والے شاعر کی زندگی کے لطیف اور نرم گوشوں کی عکاسی ہوتی ہے۔

تمام لوگ گھروں کی چھتوں پہ آجائیں
بڑی کشش ہے نئے چاند کے نظارے میں

☆

رات مجھ سے بھی تو ہر گھر کے درو بام سجے
چاند کی طرح میرا عکس خیالی نکلا

☆

رخِ روشن کا روشن ایک پہلو بھی نہیں نکلا
جسے میں چاند سمجھا تھا وہ جگنو بھی نہیں نکلا

☆

یہ خود بھی آسمان کی وسعت میں قید ہے
کیا دیکھتا ہے چاند کو چھت پر پڑا ہوا؟

☆

رات پھر جلنے لگی ہر موج لکڑی کی طرح
چاند شعلہ بن گیا دریا کے دامن کے لیے

☆

اس طرح ''جگنو'' کی علامت کے ساتھ روشنی، خود انحصاری، خودی اور رہنمائی کے احساسات وابستہ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دن کو کرنیں، رات کو جگنو پکڑنے کا ہے شوق
جانے کس منزل پہ لے جائے گا پاگل پن مجھے

☆

رُخِ روشن کا روشن ایک پہلو بھی نہیں نکلا
جسے میں چاند سمجھا تھا وہ جگنو بھی نہیں نکلا

☆

کھول یوں مٹھی کہ اک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک لمحہ کوئی اوجھل نہ ہو

☆

اقبال ساجد کی غزل میں نئی اور جدید اربن زندگی کی تمثالیں اور علامتیں بہ کثرت ملتی ہیں۔ اس کی شاعری میں فٹ پاتھ، بے گھری، غریب الوطنی اور بے سروسامانی کی علامت ہے۔ یہ ان بے گھروں کے المیے کو ابھارتی ہے جو ایک مستقل پناہ گاہ اور روشن مستقبل کا خواب آنکھوں میں سجائے مشرقی پنجاب کے مختلف اضلاع سے خون کی ندی عبور کر کے اس نئے وطن میں آئے تھے اور اب ایک بہتر زندگی کی آرزو دلوں میں بسائے فٹ پاتھ تک آ پہنچے ہیں۔ ساجد ایک ایسے معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے جہاں فٹ پاتھ رینگتے رینگتے گھروں تک آ پہنچے ہیں اور گھروں سے نکلنے والے راستے فٹ پاتھ کی طرف جاتے ہیں۔ آج بڑے بڑے شہروں کے فٹ پاتھ چلنے کی بجائے بتدریج انسانی رہائش گاہوں میں تبدیل ہو رہے ہیں جبکہ حکمرانوں کے قیمتی اور کشادہ محلوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ساجد کا اپنا تعلق بھی چونکہ غریب طبقے سے تھا اس لیے اس کی اپنی زندگی کو سمجھنے کے لیے بھی فٹ پاتھ بنیادی علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔

رات فٹ پاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اس کا بستر بھی کیا سر پہ بھی تانے رکھا

☆

ہمارا سونا ہی فٹ پاتھ کی بہار ہوا
جو چیز پہنی برنگ جمال پہنی ہے

اقبال ساجد کے ہاں ''کشکول'' غربت، بے تدبیری، تساہل پسندی، تہی دامنی اور نچلے طبقے کی محرومیوں کی علامت ہے۔ ''کشکول'' معاشی، سماجی اور سیاسی ناہمواریوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ جہاں قومی خزانہ بالادست اور مقتدر طبقے کی لوٹ کھسوٹ اور عیاشیوں کی بھینٹ چڑھ جائے وہاں کشکول، قومی اور انفرادی گداگری کی علامت بن جاتا ہے۔ بلکہ اس قسم کے بے تدبیر اور بحرانی معاشرے میں سب سے زیادہ کامیاب حکمران وہ ہوتا ہے جو در اصل سب سے بڑا گداگر

ہو۔ایک ایسی سوسائٹی جو ناقص منصوبہ بندی اور بے تدبیری کے باعث اپنی معاشی آزادی کھو چکی ہو وہاں کشکول بے غیرتی کی بجائے فخر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ایسے گداگر معاشرے میں حکمران عالمی مالیاتی اداروں سے توہین آمیز شرائط پر "خیرات" کی رُکی ہوئی قسط کے اجراء پر خوشی سے بغلیں بجاتے ہیں۔اور خیرات کو اپنی کامیابی قرار دے کر سرکاری میڈیا پر اس کا باقاعدہ ڈھنڈورہ پیٹا جاتا ہے۔اس بے تدبیری نے قوم کے معصوم بچوں کے مستقبل مالیاتی اداروں کے لاکرز میں گروی رکھ دیے ہیں۔ایسے معاشرے کے وہ بچے بھی گداگر اور مقروض شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اس دنیا میں آ کر ابھی پہلی سانس بھی نہیں لی۔ایک ایسی بے تدبیر سوسائٹی جس کا قومی بجٹ عالمی مالیاتی اداروں کے ایجنٹ ترتیب دیتے ہوں وہاں عزتِ نفس، قومی غیرت اور ذہنی و جغرافیائی آزادی کے کیا معانی ہوں گے؟ چنانچہ ایسی سوسائٹی میں ہر فرد ہی پیدائشی گداگر ہوتا ہے۔اقبال ساجد جیسا بالغ نظر شاعر اس صورتِ حال کی منظر کشی یوں کرتا ہے۔

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

خوف دل میں نہ ترے در کے گدا نے رکھا
دن کو کشکول بھرا شب کو سرہانے رکھا

ساجد کی ان مخصوص علامتوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے علامت سازی کے حوالے سے دو طرح کا کام کیا ہے۔(1)۔اس نے بہت سی بالکل تازہ علامتیں تخلیق کی ہیں۔ (2)۔پرانی علامتوں کے ساتھ نئے معانی و مطالب کو وابستہ کیا ہے۔یوں اس نے اپنی تمثالوں، استعاروں، تشبیہوں اور علامتوں کے ذریعے غزل کو ایک نیا ذائقہ دینے کی کوشش کی۔اردو غزل پر ساجد کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں۔

"ساجد ایک اچھا شاعر ہی نہیں ہمارا دوست بھی تھا۔اس نے شاعری کو اپنا لہجہ دیا مگر جیسا کہ اکثر ہوتا رہا ہے اس کی غربت اس کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوئی اور اسے وہ مقام نہ مل سکا جس کا وہ مستحق تھا(35)۔"

ساجد کے شعری اسلوب کا ایک نمایاں وصف اس کا تجسیمی انداز بھی ہے۔ جسے انگریزی میں Personification کہتے ہیں۔ یعنی غیر مجسم چیزوں کو مجسم انداز میں پیش کرنا۔ جیسے سورج کا ہاتھ، ذرّے کی آنکھ، برف کی زبان، ہوا کا ہاتھ، کرن کا پاؤں، اس قسم کی بے شمار تصویریں جدید شعراء کے ہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ اسلوب شاعری میں نیا نہیں بلکہ نثر میں تو یہ بہت پہلے سے مستعمل ہے۔ مُلّا وجہی نے "سب رس" اور محمد حسین آزاد نے اپنے مضامین میں اس اسلوب کو کمال ہنرمندی سے برتا ہے۔

جدید شعراء میں ناصر کاظمی، منیر نیازی، ظفر اقبال، جاوید شاہین، شکیب جلالی، سلیم احمد، اقبال ساجد اور بہت سے دیگر شعراء نے اس اسلوب سے خصوصی شغف کا اظہار کیا ہے۔ اقبال ساجد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رات فٹ پاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اس کا بستر بھی کیا، سر پہ بھی تانے رکھا

ممکن ہے ڈھول جھونک کے سورج کی آنکھ میں
ذرّے کا ہاتھ نیام سے شمشیر کھینچ لے

ع۔ چپ چاپ گھر کے صحن میں فاقے بچھا دیے
ع۔ غربت کی تیز آگ پہ اکثر پکائی بھوک

☆

آباد ہوئے جب سے یہاں تنگ نظر لوگ
اس شہر نے ماحول کشادہ نہیں پہنا

☆

اے شب مُفلسی، کچھ سبب تو بتا مجھ سے، ناراض ہو کر گئی تھی کہاں ؟
کس کے آنگن میں تو نے اتاری تھکن، کس کے غربت کدے میں بسیرا کیا

جہاں تک ساجد کی شعری زمینوں کا تعلق ہے یہ اتنی زرخیز، نئی اور بعض اوقات اس قدر مشکل ہوتی ہیں کہ جدید اردو غزل میں شکیب جلالی اور ظفر اقبال کو چھوڑ کر زمینوں کے حوالے سے اتنا تنوع شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں نظر آئے۔

''زمین'' میں صرف بحر ہی شمار نہیں ہوتی بلکہ یہ بحر، قافیے اور ردیف تینوں عناصر سے مل کر بنتی ہے۔ اگر نئی زمین میں نئے اور اعلیٰ خیالات وافکار پیش نہ کیے گئے ہوں تو نتیجۃً کوئی شعر اعلیٰ شعر کے درجے تک نہیں پہنچ پاتا۔ جدید غزل میں صرف یہی چیز اقبال ساجد کو منفرد بناتی ہے کہ اُس نے نئی نئی زمینوں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ان میں جدید خیالات بھی پیش کیے ہیں۔

دراصل زمین کی تخلیق کا تعلق براہ راست شاعر کے اپنے مزاج اور مینٹل اپروچ سے ہوتا ہے۔ بڑا شاعر نہ صرف خیالات بلکہ فن کے تمام پہلوؤں میں تازگئ فکر اور اپنے بڑے ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ساجد بظاہر ایک کم تعلیم یافتہ شاعر تھا مگر اس کی ذات میں ایجاد و اختراع کی صلاحیت بڑے بڑے شعراء سے کہیں زیادہ تھی۔

زمین کی تخلیق کے سلسلے میں اقبال ساجد اس قدر جدّت پسند واقع ہوا تھا کہ بڑے بڑے ممتاز شعراء اس کی زندگی ہی میں اس کی زمینوں میں تخلیقی ''کھیتی باڑی'' کرتے نظر آتے ہیں۔ ادھر اس کی کوئی نئی غزل کسی رسالے یا اخبار میں شائع ہوتی ادھر شعراء اُس کی نئی زمین میں کئی کئی غزلیں لکھ ڈالتے۔ اس سلسلے میں وہ اس قدر منفرد واقع ہوا تھا کہ نہ صرف اس نے اپنے ہم عصر فیلوز کو متاثر کیا بلکہ اس کے بہت سے جونیئر اور سینیئر شعراء بھی خود کو اس کے ''اثرات'' سے نہیں بچا پائے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

> ''اقبال ساجد نے غزل میں نئے نئے مضامین تراشے اظہار کے لیے نئی نئی زمینیں تلاش کیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم شکیب جلالی کے بعد اقبال ساجد کو غزل کا ایک بے حد مخترع شاعر قرار دے سکتے ہیں۔ جس نے غزل کی اقلیم میں اپنے فن کا سکہ جاری کیا۔ اس کے اثرات پاکستان کے ہر شہر اور قصبے میں پہنچے اور انہیں ہندوستان کے بہت سے شعراء نے بھی قبول کیا (36)۔

اقبال ساجد کی اکثر شعری زمینیں تخلیقی امکانات سے مالا مال ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی تو وہ ایسی سنگلاخ زمین کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ عام شاعر کے لیے تو ایک دو شعروں کے بعد ہی قافیہ تنگ ہو جائے مگر وہ ایسی مشکل زمینوں میں بھی بڑی سہولت کے ساتھ کئی کئی اشعار کہہ ڈالتا ہے البتہ

حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ایسی سنگلاخ زمینوں میں بھی اپنے شعری معیار کو کم نہیں ہونے دیتا۔ ساجد کی اس قسم کی زمینیں دیکھ کر مصحفی، سودا اور نظیر یاد آجاتے ہیں۔ چند اشعار دیکھتے چلئے۔

سورج ہوں چمکنے کا بھی حق چاہیے مجھ کو
میں گہر میں لپٹا ہوں شفق چاہیے مجھ کو

☆

ہر کسی کو کب بھلا یوں مسترد کرتا ہوں میں
تُو ہے خوش قسمت اگر تجھ سے حسد کرتا ہوں میں

بدن پہ میل اور چہرے پہ گردِ راہ کا رہنا
کوئی رہتا یہاں ہے شخص بے تنخواہ کا رہنا

☆

سائے کی طرح بڑھ نہ کبھی قد سے زیادہ
تھک جائے گا بھاگے گا اگر حد سے زیادہ

☆

پیچھے سے آکے دھیان کی زنجیر کھینچ لے
خوابوں کی چھت سے وہم کے شہتیر کھینچ لے

☆

ان اشعار کے مطالعے سے ساجد کی شعری انفرادیت اور بے پناہ تخلیقی جوہر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی ردیف اور قافیے اس قدر نئے، مشکل اور خوبصورت ہوتے ہیں کہ قاری کو بیک وقت حیرت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ ساجد کے اس اسلوب اور انفرادیت کے حوالے سے ممتاز شاعر قتیل شفائی لکھتے ہیں۔

"اقبال ساجد اپنا خاص اسٹائل رکھنے والا شاعر تھا۔ اگر زندگی کے نشیب و فراز اس کے راستے میں نہ آجاتے تو اس کا قلم اردو شاعری کو مالا مال کر دیتا۔ اردو ادب کو شکیب جلالی کے بعد اقبال ساجد کی وفات سے بہت صدمہ پہنچا۔" (37)

ایک نئی اور زرخیز شعری زمین یونہی وجود میں نہیں آجاتی بلکہ اس کی تخلیق کے دوران شاعر کی

پوری ذات بروئے کار آتی ہے۔ اچھا شاعر اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ہمیشہ نئی اور متنوع زمینیں تلاش کرتا ہے یا پھر زمین خود ہی شاعر کی شعری حیثیت کا احترام کرتی ہے۔ جبکہ آج کے شعراء تو کسی نئی زمین کی تشکیل کی بجائے دوسرے کی زمینوں پر ناجائز قبضہ کر کے ان میں اپنا "ہل" چلاتے نظر آتے ہیں، نتیجۃً "پیداوار" مشکوک قرار پاتی ہے۔ بعض نوجوان شعراء تو پوری پلاننگ کے ساتھ ایک منظم گروپ کی طرح دوسروں کی زمینوں پر ہاتھ صاف کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی ساری شعری تگ و دو ہی اس بات میں نظر آتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح کسی ابھرتے ہوئے مضافاتی شاعر کی نئی زمین اُچک کر اس کی "تخم کاری" کر لیں اور پھر کسی چھوٹے موٹے رسالے میں شائع بھی کروا لیں تا کہ نہ صرف "اوّلیت" کا سہرا ان کے سر پر سج جائے بلکہ یہ اشاعت "بوقتِ ضرورت" سند بھی رہے۔

ان زمین چور شعراء کے خوف سے اب لوگ نئی غزل کہیں شائع نہیں کراتے اور مشاعروں میں بھی محض سُنی سنائی غزلوں پر گزارہ ہو رہا ہے۔ نئے شعراء کی "احتیاط پسندی" کے باعث مذکورہ بالا "شاعروں" کی "تخلیقی صلاحتیں" بُری طرح متاثر ہوئی ہیں کیونکہ ان کا سارا زور پرائی زمینوں کو "آباد" کرنے پر صرف ہو رہا ہے۔ مگر جہاں تک اقبال ساجد کا تعلق ہے اسے نئی زمین تلاش کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ چونکہ نئی زمین نئے راستے کی طرح ہوتی ہے اس لیے وہ ہر بار اپنے لیے نیا راستہ منتخب کرتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ بنے بنائے راستوں پر سفر کرنا آسان بھی ہوتا ہے اور محفوظ بھی۔ جبکہ نئے راستے پر چلنے سے پاؤں کے لہولہان ہونے کا امکان رہتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے لیے ہمیشہ نئے نئے راستے چُنے۔ وہ ان نئے راستوں کے سارے کانٹے اور جھاڑیاں صاف کر دیتا تھا تا کہ بعد میں آنے والوں کے لیے آسانی رہے۔ دراصل اس کی طبیعت مقلّدانہ کی بجائے مجتہدانہ تھی۔ ساجد کی چند مزید خوبصورت زمینیں ملاحظہ کیجئے!

حاصل کرو مرے لیے نفرت کرائے پر
لے آؤ سارے شہر کی خلقت کرائے پر

☆

قتل ہو جائے گا ڈکٹیٹر نہ بن ضد چھوڑ دے

چھوڑ دے تخیبِ سخن اقبال ساجد چھوڑ دے

☆

دیوار و در کے ہاتھ سے شبتائی چھن گئی
رونق تھی جس سے گھر میں وہ تنہائی چھن گئی

☆

سُرخ لہو سے یہ پھلواڑی کرتا ہوں
میں لفظوں کی کھیتی باڑی کرتا ہوں

☆

عہدِ جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟
گر میں نہیں تو اور یہاں زندہ کون ہے؟

☆

رُخِ روشن کا روشن ایک پہلو بھی نہیں نکلا
جسے میں چاند سمجھا تھا وہ جگنو بھی نہیں نکلا

☆

سستی محبتوں کی مہنگائی کاٹتے ہیں۔
اکثر دلوں کے تاجر رُسوائی کاٹتے ہیں

☆

ایسے گھر میں رہ رہا ہوں دیکھ لے بے شک کوئی
جس کے دروازے کی قسمت میں نہیں دستک کوئی

☆

ادب اور علامت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس رجحان کے تحت جدید شعراء نے نہ صرف پرانی علامتوں کو نئے مفاہم عطا کیے (جیسا کہ فیض نے غزل میں یہ کام کیا) بلکہ بہت ساری نئی علامتیں تخلیق کر کے انہیں غزل کے دائرے میں شامل کیا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض شعراء نے قدیم اساطیری علامتوں کو نئی زندگی پر منطبق کرنے کی کامیاب کوشش کیں۔ ن۔م۔راشد، میراجی، منیر نیازی، خالد اقبال یاسر غلام، حسین ساجد اور بعض دوسرے شعراء کے ہاں اس کی

بہترین مثالیں ملتی ہیں۔

اقبال ساجد کی غزل میں بھی کہیں کہیں داستانوی اور اساطیری اسلوب ملتا ہے۔ وہ ان عناصر کے ذریعے بسا اوقات اپنے شعروں میں ڈرامائیت پیدا کر دیتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیا دیکھتا ہے یاد کا سورج طلوع کر
چوپال بھر چکی ہے کہانی شروع کر

☆

غار سے سنگ اٹھایا تو وہ خالی نکلا
کسی قیدی کا نہ کردار مثالی نکلا

☆

دربارِ شاہِ وقت کے آداب بھی تو سیکھ
سجدہ تو کرنا بعد میں پہلے رکوع کر
مظلوم ہے تو پیش ہو دربارِ وقت میں
انصاف چاہتا ہے تو زنجیر کھینچ لے

☆

ابھی جس ڈرامائیت کا حوالہ آیا ہے یہ ڈرامائیت ساجد کے کسی ایک شعر میں نہیں بلکہ اُس کے پورے لہجے میں موجود ہے۔ اس کے شعر پڑھتے ہوئے لگتا ہے جیسے ہم اسٹیج یا ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہیں۔ مختلف مناظر اپنی تمام تر فنی جزئیات سمیت آنکھوں کے آگے آتے ہیں۔ ایک ایک کر کے کردار نمودار ہوتے ہیں اور اپنا اپنا کردار ادا کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ ذرا چند اشعار دیکھیے ان میں مکالمے، کردار کی حرکات و سکنات، مناظر اور متعلقہ ماحول کس طرح ڈرامائی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا
میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغلِ اذیت پسند آئے مجھے

☆

بدن پہ میل اور چہرے پہ گرد راہ کا رہنا
کوئی رہتا یہاں ہے شخص بے تنخواہ کا رہنا

☆

میں آئینہ بنوں گا تو پتھر اٹھائے گا
اک دن کھلی سڑک پہ یہ نوبت بھی آئے گی

☆

ہائے رے حالات اک مہمان لوٹانا پڑا
میں نہیں گھر پہ یہ بچے سے کہلوانا پڑا

☆

چھینا جھپٹی کی مزاروں پر تبرک کے لیے
بھوک جب حد سے بڑھی خیرات کا کھانا پڑا

☆

جس کے لیے کیا تھا تماشا وہی نہ تھا
ہونے کو جمع شہر میں خلقت بہت ہوئی

☆

اقبال ساجد کو نہ صرف لفظوں کے استعمال کا مکمل سلیقہ آتا ہے بلکہ وہ اس ترتیب سے انہیں شعر کی لڑیوں میں پروتا ہے کہ جو لفظ جہاں رکھتا ہے وہ وہیں ہیرے کی طرح چمکنے لگتا ہے اور قاری پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ان لفظوں کو اس سے بہتر انداز میں پیش کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کی غزل کے باغیچے میں جو پھول جہاں ہے وہ وہیں اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ وہ ہمیشہ خوبصورت اور نئے استعارے استعمال کرتا ہے اور صنعتوں کو بھی نہایت ہنر مندی سے برتتا ہے۔ وہ انہیں شعر کے پیکر میں بڑی خوبصورتی سے چھپا دیتا ہے اور یوں اس کی کوئی بھی صنعت شعر کی سطح پر پڑی محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ دیگر فنی عناصر کے ساتھ مل کر شعر کا حُسن دو چند کر دیتی ہے۔ علم بدیع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ذرا سی توجہ سے محسوس کریں گے کہ اس کی غزلوں میں خوبصورت صنعتوں کا ایک رنگا رنگ دریا بہہ رہا ہے۔ ساجد نے جن صنعتوں سے گہرے شغف کا اظہار کیا ہے ان میں

ارادالشل، مراۃ النظیر، ابہام، سوال و جواب، صنعت تضاد، ترافق، قطار البعیر، فوقانیہ، تحتانیہ، لف ونشر، اطراد، صنعت عکس، تجاہل عارفانہ اور صنعت تنسیق الصفات بطور خاص شامل ہیں۔

اقبال ساجد کی غزل میں اس کی زبان بنیادی حیثیت رکھتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زبان کے استعمال کے حوالے سے ایک خاص اپروچ ہی اس کی غزل کا نمایاں وصف ہے۔ اس نے غزل میں Modern Sensibility کے ساتھ نئی زبان برتنے کی بھی کوشش کی۔ اس کی غزلوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ زبان غزل میں نئی ہونے کے باوجود اجنبی اور غیر شاعرانہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے یہ زبان کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تشکیل نہیں دی بلکہ اس کے سوتے بڑی حد تک ہماری غزل ہی سے پھوٹتے ہیں۔ اس نے نہ صرف غزل میں نئی لفظیات کا اضافہ کیا بلکہ ان لفظوں کے اندر چھپے امکانات کو اس طرح شعری تجربے کا حصہ بنایا کہ یہ الفاظ اس کی زندگی ہی میں غزل کے معروف الفاظ قرار پائے۔ وہ کم پڑھا لکھا تھا مگر وہ غزل کے مزاج اور امکانات کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

اقبال ساجد نے جس عہد میں غزل لکھنی شروع کی اس وقت دو طرز ہائے زندگی ایک دوسرے سے الگ ہو رہے تھے۔ جب سوسائٹی میں تبدیلی کا عمل اتنا تیز ہو تو فن جو کہ سوسائٹی ہی کی پیداوار ہوتا ہے اس سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟ لہٰذا ساجد کے لیے غزل میں نئی تبدیلیوں اور زبان کی دریافت کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اس نے نئے الفاظ کو اپنی غزل میں بے دریغ استعمال کیا جو نئی زندگی کی بنیادی لفظیات قرار پا رہی تھی۔ وہ انہی نئے الفاظ سے کام لے کر اچھی غزل کے لیے راہ ہموار کر رہا تھا اور غزل کو ایک نئی زبان دے رہا تھا۔ زبان کے حوالے سے اس نے کسی خاص شاعر کا رنگِ سخن اختیار کرنے کی بجائے اظہار کی نئی راہیں تراشیں۔ اُسے الفاظ کے استعمال اور معنی کی جہتوں سے حیرت انگیز حد تک آشنائی اور رسائی تھی۔ بہت سے دیگر جدید شعراء نے بھی نئے نئے الفاظ کو غزل کے دامن پر ٹانکنے کی کوشش کی ہے مگر ایسی کوششیں بہت کمزور ثابت ہوئی ہیں اور اکثر اوقات یہ الفاظ غزل کے مخصوص مزاج کا حصہ نہیں بن پائے۔ اس کے برعکس ساجد کا فنی کمال یہ ہے کہ اس نے ان نئے الفاظ کو ایسی چابکدستی کے ساتھ برتا ہے

کہ ایسے لگتا ہے کہ یہ الفاظ سالہا سال سے غزل کا حصہ ہیں۔

مثال کے طور پر چائے، پیالی، بدمعاش، تفتیش، پڑوسی، تپ دق، گالی، شال، گھاس، گاہک، دیمک، دولہا، سیڑھی، پتیل، لاٹھی، تاڑی، ایندھن، گاڑی، جھاڑی، پھلواڑی، کھیتی باڑی، جھگڑا، لحاف، چھاپہ خانہ، جیل، بوری، اشتہار، مداری، پٹارہ اور اینٹ جیسے الفاظ اگر چہ ہماری روز مرہ زندگی میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں لیکن ضروری نہیں کہ جو لفظ ہماری گفتگو میں بکثرت استعمال ہو رہا ہو وہ غزل میں بھی جگہ پائے؟ چونکہ غزل کی ایک مخصوص زبان اور تہذیب ہے اور یہی تہذیب غزل کی تخلیق میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے بلکہ دیکھا جائے تو غزل خود ایک تہذیب ہے۔ غزل اگر چہ نئے نئے تجربات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے مگر یہ ایسے "تجربات" کو بھی شرفِ قبولیت نہیں بخشتی جو محض "چونکانے" اور اوّلیت کا سہرا باندھنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ان دنوں ایک نوجوان شاعر آزاد غزل کی پرانی پتنگ کو نئی پڑیا میں پیش کر کے اوّلیت کے درجے پر فائز ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ غزل میں نئے تجربات بہت اچھی بات ہے مگر یہ تجربے غزل بھی تو تخلیق کریں محض "تجربہ" بن کر نہ رہ جائیں؟

بہت سے جدید شعراء نے غزل میں اوٹ پٹانگ الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ مگر ساجد نے نئے الفاظ کو غزل میں جس خوبصورتی کے ساتھ برتتے ہوئے غزل کے ذخیرۂ الفاظ میں شامل کیا ہے یہ اُسی کا حصہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

چائے کی پیالی میں ہاں میں ہاں ملانا پڑ گئی
دوستوں میں خود کو برخوردار بھی کرنا پڑا

☆

شہر کے باغ میں ہوجائے ملاقات تو پھر
کون گلیوں میں رُکے، کون بس پیچ ٹھہرے؟

☆

کیا لطف اوڑھنے میں پرانے لحاف کو
اُس کے بدن کی رُوئی سے گرمائی چھن گئی

☆

پہلی سیڑھی پر قدم رکھ آخری سیڑھی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں رائیگاں اک پل نہ ہو

☆

سب کی شکلوں میں تری شکل نظر آئی مجھے
قرعۂ فال مرے نام پہ گالی نکلا

☆

ع۔ اِس دُکان پر آج تک آیا نہیں گاہک کوئی
ع۔ رقصِ خوشی سے پی کرتاڑی کرتا ہوں
ع۔ دوستو! روٹی کی خاطر جیل بھی جانا پڑا
ع۔ حیرت ہے اس گھڑے سے بھی چکنائی چھن گئی

اسی طرح غزل میں انگریزی الفاظ کے استعمال کے حوالے سے بھی جدید غزل گو شعراء ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں انگریزی الفاظ کے استعمال کے حوالے سے بعض نقاد بھی برہم دکھائی دیتے ہیں لیکن اہم سوال تو یہ ہے کہ آیا غزل کو انگریزی الفاظ سے "پاک" رکھنے کے لیے اس کے آگے کوئی بندھ باندھا جا سکتا ہے؟ بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا کیونکہ انگریزی سوسائٹی کے علوم و فنون اور مصنوعات و ایجادات (جن کے نام بھی انگریزی میں ہیں) جس تیزی سے ہماری زندگی میں جگہ پا رہی ہیں اسی رفتار سے ہماری زبان و ادب کا حصہ بھی بن رہی ہیں۔ لہٰذا انہیں اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنائے بغیر بظاہر کوئی چارہ نہیں۔ اور ویسے بھی یہ ایک لسانی اصول ہے کہ زبانیں وہی زندہ رہتی ہیں جن میں تخلیق اور ایجاد کا اعلیٰ پائے کا کام جاری رہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انفرمیشن ٹیکنالوجی اور میڈیا کے ناقابلِ یقین حد تک بڑھتے ہوئے کردار کے پیشِ نظر شاید یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ صرف وہی زبان زندہ رہے گی اور دنیا پر راج کرے گی جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے اظہار کے سلسلے میں مکمل وسائل سے لیس ہوگی۔ جو زبانیں اور تہذیبیں سائنس اور ٹیکنالوجی سے قریبی تعلق پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوں گی وہ شاید ہی ایک زندہ زبان کے طور پر اگلی صدی میں داخل ہو پائیں؟ آئندہ صدی آتے آتے آج کی دنیا کی بیشتر زبانیں شاید تاریخ کے صفحات ہی میں زندہ ہوں گی؟ لہٰذا یہ وقت ہے کہ ہمیں رک کر اپنی

زبان اور کلچر کے حوالے سے زیادہ سائنٹفک اور حقیقت پسندانہ روّیہ اپنانا چاہیے۔ ورنہ تو شاید ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں؟ میرے نزدیک ہمیں اپنی زبان کے حوالے سے زیادہ لبرل رویۂ اپنانا ہوگا ورنہ برصغیر ہی کی ایک بڑی زبان سنسکرت کا انجام ہمارے سامنے ہے۔ جس میں اعلیٰ پائے کا لٹریچر بھی موجود تھا مگر بے پناہ تعصب اور غیر تخلیقی اپروچ نے ماضی کی اس عظیم زبان کو قصۂ پارینہ بنا کر رکھ دیا۔

زبان کے سلسلے میں اقبال ساجد بھی خاصی لبرل اپروچ رکھتا ہے مگر اس حوالے سے جدید شعراء اور اس کے ہاں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ انگریزی الفاظ کو فیشن کے طور پر غزل میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ صرف انہی الفاظ سے استفادہ کرتا ہے کہ اردو زبان میں یا تو ان کے مناسب مترادفات موجود نہیں یا پھر وہ الفاظ ہماری روزمرہ زندگی میں اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ اردو زبان کے مخصوص مزاج کے نتیجے میں اب وہ اسی کا حصہ بن چکے ہیں۔ پہلے ذرا ساجد کے ہمعصروں کے چند اشعار دیکھئے!

نقشہ تھا ٹُنڈ منڈ درختوں کے آر پار
تھے اُس کے شارٹ کوٹ پہ چھینٹے شراب کے

☆

(ظفر اقبال)

کھڑی ہوئی تھی وہ فٹ پاتھ کے کنارے پر
سڑک کو چلتی ہوئی موٹروں نے گھیرا تھا

☆

(ناصر شہزاد)

بی۔اے کرکے لونڈے کے رہ گئے دو کام
تنہا بیٹھے ریڈیو ساتھ ملے تو تاش

☆

(انجم رومانی)

دھیان کے ٹیلیویژن پہ میں گڑیاں دیکھ کے اُس کو
تاج محل میں تنہا بیٹھا سگریٹ پھونک رہا ہوں

☆

(صادق)

رات کا جنگل تھا ہم اک دوسرے میں کھو گئے
بلب جتنے تھے نواحِ جاں میں روشن ہو گئے

☆

(عتیق اللہ)

ان مثالوں کے بعد اب ذرا اقبال ساجد کے چند اشعار بھی دیکھئے۔

میں نے لوگو اپنی سوچوں کی سمگلنگ آپ کی
جرم جب عائد ہوا انکار بھی کرنا پڑا

☆

چلتے پھرتے تھیٹروں میں ایک جوکر کی طرح
ہنسنے رونے کا مجھے کردار بھی کرنا پڑا

☆

رات فٹ پاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اُس کا بستر بھی کیا ، سر پہ بھی تانے رکھا

☆

کیا کروں پتھر کو انجکشن لگانا پڑ گئے
وہ کہ بے حس تھا اسے بیدار بھی کرنا پڑا
اُگا نہ سبزہ تو اُس نے اجاڑ گھر کی منڈیر
پلاسٹک کی ہری بیل سے سجاتی دیکھ

☆

میں اشتہار لگاؤں بدن پہ غزلوں کے
وہ چاہتا کہ شوکیس میں سجائے مجھے

☆

قتل ہو جائے گا ڈکٹیٹر نہ بن ضد چھوڑ دے
چھوڑ دے تختِ سخن اقبال ساجد چھوڑ دے

☆

اب پڑھے لکھے بھی ساجد آ کے بیکاری سے تنگ
شب کو دیواروں پہ چسپاں پوسٹر کرنے لگے

☆

سستے ہوئے ہیں اتنے کہ شہرت کرائیں کیش
وہ لوگ جن کے نام کی مہنگائی چھن گئی

☆

دوسروں کے جرم اپنے نام لکھوانا پڑے
دوستو! روٹی کی خاطر جیل بھی جانا پڑا

☆

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انگریزی الفاظ کو کس روانی اور فنی پختگی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

ساجد کی غزل میں الفاظ کے تین دھارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

(1)۔ہندی الفاظ (2)۔فارسی الفاظ (3)۔انگریزی الفاظ

الفاظ کے ان تین دھاروں کے ملاپ بلکہ سنگم پر وہ غزل جنم لیتی ہے جو اقبال ساجد کو ہمعصر شعراء کی صف میں بلند مقام عطا کرتی ہے۔اردو غزل پر ہمیشہ سے فارسی زبان و اسالیب کے اثرات بہت گہرے رہے ہیں۔لیکن ساجد کے ہاں شعوری یا پھر لاشعوری سطح پر ہندی اسالیب فارسی کی نسبت زیادہ نمایاں ہیں۔

مثلاً پیڑ، گاہک، دیمک دولہا، سانپ، مٹھی، جگنو، سیڑھی، سونا، چیل، آنچ، گھنگرو، لاٹھی، کرنیں، برگد، چھاؤں، تالی، کھلاڑی، جھاڑی، کائی، کھیتی باڑی، گھڑا، پھلواڑی، چکنائی، روئی، چھتری، جانور، روٹی، پیالی، ہاتھ، آنکھ، کاجل، کسوٹی، آنگن، تھکن، بسیرا، بستی، باسی، سورج، سویرا، روپ،

چال، دھنک، پڑوسی، بھیڑ، سڑک، کانچ، لہو، آگ اور پانی نہ صرف ہندی ہیں بلکہ ساجد کی غزل کے بنیادی لفظیات بھی ہیں۔

جہاں تک فارسی الفاظ کا تعلق ہے یہ اگر چہ ہندی کی نسبت کم ہیں لیکن فارسی الفاظ کی مٹھاس نے اس کی غزل کو وہ شیرینی بخشی ہے جو جدید شعراء میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ آیئے اب ذرا ساجد کی چند خوبصورت فارسی تراکیب دیکھتے ہیں۔

مثلاً کارِ فکر وفن، طوقِ شکست، توہینِ اربابِ خرد، طوافِ مہ وانجم، جشنِ لغمت، طریقِ حسنِ خضوع وخشوع، سحرِ شب، بازارِ رنگ وبو، خوئے قناعت، دعوتِ اوراقِ گل، کتابِ خاک، فصیلِ وقت، بنیادِ فصیلِ ودر، شہرِ خواب آور، خوشبودار چہرے، کربِ ثمر آ ود، صبحِ حنا رنگ اور شوقِ نقل مکانی جیسی خوبصورت اور تخلیقی امکانات سے بھر پور تراکیب اس کی غزل کے حسن کو دوبالا کر رہی ہیں۔

جہاں تک انگریزی ادب کے اثرات کا تعلق ہے یہ صرف الفاظ کی حد تک ہیں۔ چونکہ ساجد صرف غزل کا شاعر ہے اور غزل کے اپنے مخصوص تقاضے اور کلچر ہے جبکہ غزل اور انگریزی ادب کے مزاج میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ہاں البتہ ساجد نے سمگلنگ، فٹ پاتھ، پلاسٹک، شوکیس، جیل، ڈکٹیٹر، کیش، کرنسی، پوسٹر، تھیٹر، جوکر اور انجکشن جیسے الفاظ غزل کے دامن میں ٹانک کر غزل کی لفظیات کے کینوس کو وسیع کرنے کا ایک تجربہ کیا ہے جس میں وہ کم از کم اپنے ہمعصروں سے زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ ساجد کی شعری زبان ہندی، فارسی اور انگریزی الفاظ و اسالیب سے مل کر تشکیل پاتی ہے اور یوں ان تینوں زبانوں کے ملاپ کے نتیجے میں وہ زبان وجود میں آتی ہے جس کے باعث ساجد جدید غزل کا ایک اہم اور نمائندہ شاعر قرار پاتا ہے۔

جہاں تک اقبال ساجد کی غزل کے لہجے کا تعلق ہے اس کا لہجہ کئی ممتاز لہجوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ اس کی غزل کے بغور مطالعہ کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس لہجے پر میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، یگانہؔ، اقبالؔ اور شاد عارفیؔ کے لہجوں کتنے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ اثرات اس نے شعوری سطح پر قبول کئے ہوں بلکہ شعوری سطح پر تو وہ اپنے سینئرز فراقؔ، فیضؔ، ندیم

اور فراز کی مکمل نفی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ سینئر نسل ہی ادبی فضاء کو اپنی کاوشوں کے نتیجے میں زیادہ تخلیقی اور تخلیقی عمل کے لیے سازگار بناتی ہے جس سے بعد میں آنے والی نسل شعوری اور لاشعوری سطح پر استفادہ کرتی ہے۔ بلکہ سینئر نسل کے بڑے شعراء غیر محسوس طریقے سے بعد میں آنے والی نسلوں پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض لوگ ان شعراء کے اثرات اس حد تک قبول کرتے ہیں کہ صاف صاف ان کی نقالی پر اتر آتے ہیں اور بعض کے ہاں یہ اثرات صرف اکتساب و انجذاب کی حد تک ہوتے ہیں۔

انگریزی زبان کے نامور نقاد ٹی ایس ایلیٹ کے بقول ہر بڑا شاعر اپنے سے پہلے گزرنے والے بڑے شعراء کے کاندھوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ساجد کے لیے بھی سینئر شعراء کے اثرات سے بچنا بظاہر ممکن نہ تھا۔ اس کے لہجے پر جہاں تک میرؔ کے اثرات کے تعلق ہے درج ذیل اشعار کے مطالعے سے یہ بات پوری سچائی کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ ساجد نے زندگی میں مہذب پن اور خوش سلیقگی کے اثرات میرؔ صاحب ہی سے قبول کیے ہیں۔

پھینک یوں پتھر کہ سطحِ آب بھی بوجھل نہ ہو
نقش بھی بن جائے اور دریا میں بھی ہلچل نہ ہو
کھول یوں مٹھی کہ اک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک لمحہ کوئی اوجھل نہ ہو

ساجد کے لہجے میں ایک خاص قسم کی دردمندی، کردار میں خوش سلیقگی، شہرِ سنگ میں آئینہ برداری اور ایک مخصوص قسم کی تہذیبی سطح میرؔ ہی کی دین ہے۔

اسی طرح ساجد کے مزاج میں جو اکھڑ پن اور طنطنہ ہے وہ براہِ راست سوداؔ کے مزاج سے زیادہ قریب ہے۔ مثال کے طور پر

ریزگی کا ڈر ہے تو ہٹ جائے میری راہ سے
خود بخود رستہ مرا، ہر سنگِ جادہ چھوڑ دے

☆

چپ کس لیے ہے اینٹ کا پتھر سے دے جواب
حق چاہیے تو میان سے شمشیر کھینچ لے

ان عناصر کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں دکھوں کے درمیان بھی خود کو قائم رکھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ وہ یقیناً غالبؔ ہی سے مستعار ہے۔ غالبؔ جو بے شمار سماجی مسائل کے باوجود ذات کی اکائی کی مکمل حفاظت کا قائل ہے مگر ساجد کے اندر غالبؔ جیسی وہ زندہ دلی نظر نہیں آتی جس کے نتیجے میں غالبؔ تمام ترغموں اور پریشانیوں کے باوجود ان دکھوں کو ایک جاندار قہقہے میں اڑا دیتا ہے اور دوسروں پر ہنسنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اپنی ذات پر بھی قہقہہ لگانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

ساجد کا شعر ہے۔

حوصلہ قائم رکھا گھر کے دکھوں کے درمیاں
دل کا آئینہ کسی بھی حال میں ٹوٹا نہیں

اسی طرح رواداری، روشن خیالی اور وسیع المشربی کے عناصر بھی ساجد نے غالبؔ ہی سے مستعار لیے ہیں۔ وہ کہتا ہے

ہمارا دل تو ہے انسانیت کا گہوارہ
بسے ہوئے ہیں یہاں شیخ بھی برہمن بھی

ایک تیسری بات جو اقبال ساجد نے براہِ راست غالبؔ سے قبول کی ہے وہ اس کی شعری انا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

عہد جدید تر کا نمائندہ کون ہے ؟
گر میں نہیں تو اور یہاں زندہ کون ہے؟
تنہا ہے کون، کس کے یہ بازو ہیں ان گنت
تھامے ہوئے یہ پرچم آئندہ کون ہے؟

☆

فراقؔ و فیضؔ و ندیمؔ و فرازؔ کچھ بھی نہیں
نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں
پرانی سیڑھیوں پہ میں نئے قدموں کو کیوں رکھوں؟
گراؤں کس لیے چھت سر پہ بوسیدہ عمارت کی؟

سماجی و عصری شعور، مزاج میں ایک خاص طرح کی بیزاری اور اکتاہٹ، ذات کا شدید احساس، شخصیات شکنی، دوسروں کو مسترد کرنا اور غزل میں عشقیہ عناصر کی خشکی یہ سارے اثرات ساجد نے یگانہؔ سے قبول کیے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غالبؔ کے بعد اس کے لہجے پر سب سے زیادہ اثرات یگانہؔ کے ہیں تو شاید یہ بے جا نہ ہوگا۔ چند مثالیں دیکھیے۔

فکرِ معیارِ سخن باعثِ آزار ہوئی
تنگ رکھا تو ہمیں اپنی قبا نے رکھا

☆

ہر کسی کو کب بھلا یوں مسترد کرتا ہوں میں
تو ہے خوش قسمت اگر تجھ سے حسد کرتا ہوں میں

☆

میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغلِ اذیت پسند آئے مجھے

☆

رنگ پر آئی ہوئی ہے اب جنوں خیزی مری
رات دن تو ہینِ اربابِ خرد کرتا ہوں میں

☆

ہر بار میری راہ میں حائل ہو نیا سنگ
ہر بار کوئی تازہ سبق چاہیے مجھ کو

☆

مزال جائے گا تجھ کو بھی سنگِ راہ بننے کا
ترے جیسے تو میرے پاؤں کی ٹھوکر میں رہتے ہیں

☆

کوئی گلاب بھی مارے تو مشتعل ہو جاؤں
کہ رنگ و نور کی بارش بھی اب جلائے مجھے

ساجد کے ہاں سماجی حقائق کا جو اتنا گہرا مشاہدہ ملتا ہے اور ان کے خلاف وہ جس طرح کٹیلے لہجے میں ردعمل کا اظہار کرتا ہے یہ سارا یگانہ ہی کا مزاج ہے جو ساجد کی آواز پر اثر انداز ہوا۔ اس اثر پذیری کا بڑا سبب شاید دونوں شعراء کے سماجی و سیاسی حالات میں پائی جانے والی مماثلتیں ہیں۔ مزید کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہائے رے حالات اک مہمان لوٹانا پڑا
میں نہیں گھر پہ یہ بچے سے کہلوانا پڑا

☆

اب تو دروازے سے اپنے نام کی تختی اتار
لفظ ننگے ہوگئے ، شہرت بھی گالی ہوگئی

اسی طرح ساجد کے لہجے میں عرفانِ ذات، عظمتِ ذات اور یقین کا جو گہرا احساس ملتا ہے یہ براہِ راست اقبال ہی کا اثر ہے۔

خلاء کے آر بھی ہوں میں ، خلاء کے پار بھی ہوں میں
عبور اک پل میں ہوجائے حدود ممکنات اپنی
جیوں گا اپنی مرضی سے ، مروں گا اپنی مرضی سے
مرے اپنے تسلط میں ہے موت اپنی حیات اپنی

☆

ان تمام شعراء کے اثرات کے ساتھ ساتھ ساجد کے لہجے میں ایک خاص طرح کا تنقیدی شعور اور سماجی اور معاشرتی ناہمواریوں پر کٹیلے انداز میں طنز کا جو رجحان ہے یہ اثرات اس نے شاد عارفی سے قبول کئے ہیں۔ ساجد کی ساری شاعری پر یہ کٹیلا اور ناقدانہ لہجہ غالب ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کا سارا لہجہ دراصل اسی کٹیلے پن ہی پر مشتمل ہے۔ جو اس کی غزل میں نیا ہونے کے باوجود شاد عارفی سے مستعار ہے۔ چند اشعار۔

شہر کے باغ میں ہوجائے ملاقات تو پھر
کون گلیوں میں رکے کون پس چق ٹھہرے؟

☆

اب رفتگاں کی محنت ہے تجربہ ہمارا
وہ کوہ کاٹے تھے ہم کائی کاٹتے ہیں

☆

کیا لطف اوڑھنے میں پرانے لحاف کو
اُس کے بدن کی رُوئی سے گرمائی چھن گئی
جانور کی کھال پہنی اور چلا پنجوں کے بل
بن گیا بہروپیا ، بازار میں آنا پڑا

☆

صاحب اگر ہیں آپ تو سب آپ کے غلام
ہر شئے ملے گی حسب ضرورت کرائے پر

☆

یوں ان سارے شعراء کے لہجوں کے سنگم پر اقبال ساجد کا لہجہ جنم لیتا ہے۔ آج جب کے روزانہ دسیوں بیسیوں شعری مجموعے مارکیٹ کر کے لالچی پبلشرز اور شہرت کے لیے ترستے ہوئے شعراء اپنے تئیں عظیم تخلیقی کارنامے انجام دینے میں مصروف ہیں مگر آوازوں کے اس ہجوم میں آج بھی اقبال ساجد کی آواز اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے ہے۔ اگرچہ اس نے میر، غالب، یگانہ اور سودا سے لے کر شاد عارفی تک کے اثرات قبول کیے مگر درحقیقت یہ اثرات اثر و انجذاب تک ہی محدود ہیں۔ اس نے کسی بھی شاعر کی تقلید کرنے کی شعوری کوشش کی اور نہ ہی اس میں تقلید کا مادہ تھا۔ بلکہ یہ سارے اثرات غیر محسوس انداز میں اس کے لہجے پر اثر انداز ہوئے ہیں مگر ان تمام اثرات کو قبول کرنے کے سلسلے میں اس نے مقلدانہ روّیے کی بجائے خلاّقانہ روّیے کا اظہار کیا۔ یوں اس کی آواز مذکورہ بالا آوازوں میں گم ہو کر بھی اپنی شناخت کو برقرار رکھتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ساجد اپنے مضامین، اسالیب، آہنگ، زبان و بیان، لہجے اور طرزِ احساس کے حوالے سے اپنے ہمعصر شعراء کی صفِ اول میں کھڑا نظر آتا ہے۔ وہ ایک خوبصورت شاعر ہے جس کی آواز کو ایک لمبے عرصے تک یاد رکھا جائے گا اور آنے والے دنوں میں اردو غزل جو بھی کروٹ لے گی اقبال ساجد غزل کے ماتھے کا جھومر قرار پائے گا۔

اقبال ساجد ایک ناراض خُو شاعر

اقبال ساجد کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ ایک ناراض خُو فنکار اور انسان تھا۔ یہ ناراض خُوئی بیک وقت سسٹم، اپنی ادیب برادری اور خود اپنی ذات کے ساتھ بھی ہے۔ ناراض خُوئی کی یہ لہر اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل ہی سے دنیا بھر میں محسوس کی جانے لگی تھی لیکن دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں مغرب میں لوگوں نے سٹرکچر کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کرنا شروع کیا اور سٹرکچر یا اتھارٹی کے مقابلے میں جمہوریت، آزادی اور مساوات کے نعرے لگے اور اتھارٹی کے ساتھ عوامی کردار اور توقعات کو نئے سرے متعین کرنے کی باتیں شروع ہوئیں۔

چنانچہ لوگوں میں وجودیت، انفرادیت پسندی، ہپی ازم، انارکزم اور مارکسزم جیسے نظریات کی بڑھتی ہوئی مقبولیت بڑی حد تک اتھارٹی یا سٹرکچر کے خلاف فرد کے عدم اطمینان اور غم و غصے ہی کو ظاہر کرتی ہے۔ ان تمام رجحانات کے پس پردہ ایک ہی خواہش اور کوشش کارفرما تھی کہ فرد کو زیادہ سے زیادہ آزاد ہونا چاہیے۔ چنانچہ عالمی لٹریچر کے حوالے سے ژاں پال سارتر، ہرمن ہیسے، ایمی سیزار، پابلو نرودا، کافکا اور اردو میں ساحر لدھیانوی، منٹو، عصمت، فیض، حبیب جالب اور اقبال ساجد فرد کے مذکورہ رجحانات کے نمائندہ لکھاری ہیں۔

ہمارے ہاں آج تک فرد کے مقابلے میں سٹرکچر یا اتھارٹی ضرورت سے زیادہ طاقتور رہی ہے۔ ایک علاقہ دوسرے علاقے کا استحصال کرتا ہے۔ جبکہ ایک سازش کے ذریعے قیام ملک کے وقت مساواتی بنیادوں پر سوسائٹی تشکیل دینے کی بجائے نئے ملک میں وہی طبقاتی تقسیم روا رکھی گئی۔ ملکی وسائل پر مخصوص طبقے کا کنٹرول، کلچرل شناخت میں ناکامی، ہجرت اور اس سے وابستہ آئیڈیل ازم کی توڑ پھوڑ، جمہوری اداروں کے مقابلے میں بیوروکریسی کی مضبوطی، میڈیا پر ریاستی

کنٹرول اور مذہبی، لسانی اور جغرافیائی حوالے سے اٹھنے والی تشدد کی لہریں ہمارے ہاں فرد کو دن بدن کمزور و بے بس اور سسٹم کو مزید مستحکم کر رہی ہیں۔ چنانچہ ایسی سوسائٹی جس کے تشکیلی عناصر میں انسانی ذلت بنیادی فیکٹر کے طور پر کارفرما ہو، جہاں انسانوں میں کمیونیکیشن کا فقدان ہو، جہاں ایک طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال کر رہا ہوں، جہاں دوسرے کا گلہ دبانے اور کہنی مار کر آگے نکلنے والوں کو ''کامیاب'' انسان گردانا جائے، ایک ایسا سماجی، معاشی نظام جس کی بنیاد ڈاکوازم پر ہو۔ اُس میں ساجد کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو وہ انسان دشمن سسٹم سے سمجھوتہ کر کے اپنا گھر بھر لے۔ بصورت دیگر ایک ایسا سسٹم جو انسانی امنگوں اور توقعات پر پورا نہیں اترتا اس کے خلاف اعلان جنگ کر دے چنانچہ اس نے اپنے لیے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ اُس نے ''سٹیٹس کو'' کے خلاف آواز بلند کی۔ سٹیٹس کو جس کے نتیجے میں ہماری کئی نسلیں ڈپریشن اور فرسٹریشن کا شکار ہوئیں۔ ان نسلوں پر جب آگے بڑھنے کے مواقع اور راستے بند کر دیئے گئے تو وہ ''اداس'' یا پھر ناراض ہو کر تاریک راہوں پر چل پڑیں۔ اقبال ساجد انہی لوگوں میں سے اُبھر کر سامنے آیا تھا لہٰذا وہ اس پورے سسٹم کے خلاف سراپا احتجاج بن گیا جو آرزوؤں سے لبریز دلوں کو بے رحمی سے کچل ڈالتا ہے۔

بتا اِس دور میں اقبال ساجد کون نکلے گا؟
صداقت کا علم لے کر اگر تُو بھی نہیں نکلا

اقبال ساجد ایک ایسی زر پرست سوسائٹی کے خلاف تنہا لڑ رہا تھا۔ جہاں تخلیق اور تخلیق کار کو تیسرے درجے کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ وہ استحصالی اداروں اور ان سے وابستہ افراد کے چہروں سے نقاب کھینچتا ہے۔ جو خود تو بدحرام ہیں لیکن دوسروں کی محنت پر عیاشی کرنے میں مصروف ہیں ساجد اس ناانصافی پر چپ نہیں رہ سکتا بلکہ احتجاج کرتا ہے۔

ستم تو یہ ہے وہ فرہادِ وقت ہے جس نے
نہ جُوئے شیر نکالی نہ بُت تراش ہوا

اور

ٹھہرے ہیں زر و سیم کے حقدار تماشائی
اور مارِ سیہ ہم نے دفینے سے نکالا

چنانچہ ایک ایسا سسٹم جو تیسری دنیا پر مسلط کر دیا گیا ہے جو انسانی اُمنگوں کا دشمن ہے، جو انسانی

آزادی، مساوات، عزتِ نفس، انصاف اور محبت کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے
ساجداسے ملیامیٹ کردینا چاہتا ہے۔

پہنائے وسعتوں کو نیا دائرہ کوئی
اس چرخ کو نظامِ کہن سے نکال دے

ساجد ایک ایسی بستی کی تصویریں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جہاں شاعر سمیت لوگ بھوک
پہنتے اور پیاس اوڑھتے ہیں۔ آنگنوں میں فاقے بچھائے جاتے ہیں اور غربت کی تیز آگ پر اکثر
بھوک پکائی جاتی ہے۔ انسان تبرک کے لیے مزاروں پر چھینا جھپٹی کر رہے ہیں، جہاں انسان
جانور کی کھال پہن کر بچوں کے مل چلتا ہے، جہاں چند سکّوں کے عوض دوسروں کے جُرم اپنے نام
لکھوا لیے جاتے ہیں، گھر آنے والے مہمانوں کو بہانے سے بچوں کے ذریعے دروازے سے لوٹا
دیا جاتا ہے۔ انسان کو سانسوں کے تسلسل کے لیے ہسپتالوں میں اپنے خون کا بیوپار کرنا پڑتا ہے
اور قدم قدم پر عزتِ نفس پر منظم حملے کیے جاتے ہیں۔ ایسے میں شاعر ایک لمحے کے لیے سوچتا ہے
کہ کیوں نہ ظالموں کی ''پیشکش'' کو قبول کرتے ہوئے اصولی جنگ سے دستبردار ہو کر، ظالموں
کے ساتھ ہاتھ ملالے اور ایک خوبصورت اور آسودہ زندگی کا آغاز کرے۔

ظالموں کے ساتھ مل جاؤ رہو گے عیش میں
عمر ساجد کسمپرسی میں بسر کرتے ہو کیوں؟

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتا ہے اور اس اصولی جنگ میں ثابت
قدمی اور امداد کے لیے اپنے خدا کی تائید و حمایت کا طالب ہوتا ہے۔

یارب نہ کبھی میرے اصولوں میں لچک آئے
جب جنگ چھڑے تیری ہی جانب سے کمک آئے

کرپٹ سسٹم کے خلاف جنگ، شاعر قلم کے ذریعے جیتنا چاہتا ہے لیکن جب وہ اپنے اردگرد
قلم کے نام پر ہونے والی کرپشن دیکھتا ہے تو اسے مزید ایک محاذ ان نام نہاد قلم کاروں کے خلاف
بھی کھولنا پڑتا ہے جو خود تو لفظ تخلیق نہیں کرسکتے البتہ اپنی دولت کے بل پر چور دروازوں سے ادب
میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ساجد انہی لوگوں پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے

پیسہ ہے تیرے پاس تو کچھ نام بھی کما
لے آ کسی غریب سے شہرت کرائے پر

اور

باب ۔ سخن میں اب وہی مشہور ہوگئے
وہ جن کے ذہن سے کوئی کاوش نہیں ہوئی

جس طرح باقی زندگی میں غیر مستحق لوگ مختلف شعبوں میں چھائے ہوئے تھے اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے بعض بڑے محکموں کے افسران اور ان کی بیگمات بھی بطور قلم کار اخبارات و جرائد کی زینت بننے لگے تو ساجد نے ان کی جعلی شہرت پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

ٹوٹیں گی جب طنابیں رہ جائیں گے شکو کے
کھنچ کر بڑے ہوئے ہیں یہ آدمی ربڑ کے

اب تک کی ساری جنگ اور احتجاج میں شاعر نے خود کو ہر طرح کی کرپشن سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی قسم کی آمدنی کا ذریعہ نہ ہونے اور زندگی کی چھوٹی بڑی ضروریات کے حصول، بچوں کی کفالت، شراب کی کمی کی فراہمی نیز زندگی کے دباؤ کے سامنے وہ خود کو کرپشن سے نہ بچا سکا اور اس نے سستے داموں غیر تخلیقی خواتین و حضرات کے ہاتھوں اپنی غزلیں بیچنا شروع کر دیں۔

اس بارے میں قطعاً دو آراء نہیں کہ بہت سے لوگ اس کی غزلوں کے خریداروں میں شامل تھے۔ لیکن میرے نزدیک اگر کسی سے غزل خرید کر اپنے نام سے پڑھنا یا شائع کرانا کرپشن ہے تو یقیناً وہ تخلیق کار بھی اس میں برابر کا شریک ہے جو ان غیر تخلیقی لوگوں کو "قلمکار" بننے میں مدد دیتا ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف خود بیچنے والے شاعر بلکہ دیگر مستحق اہل قلم کے استحصال کا دروازہ بھی کھلتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال ساجد تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ ایک غلط سسٹم کے خلاف آواز بھی بلند کرتا ہے اور دوسری طرف اس کا حصہ بھی بننے لگا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ وہ کسی شاعر کے ہاتھ غزل فروخت کرنے کے بعد کسی قسم کی راز داری کا مظاہرہ نہیں کرتا ادھر کوئی غزل خرید کر روانہ ہوتا اُدھر وہ سب کو بتا دیتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے

کہ اس کی ڈکشن ہی ایسی ہے کہ ساری کہانی فروخت ہونے والی شاعری خود اُگل دیتی۔

مرے اشعار ہی کر دیتے ہیں نیکی ظاہر
شعر کی بھیک جنھیں میں نے تھما کروی ہے
شکل اس کی تھی مگر تختی تھی میرے نام کی
چور ثابت کردیا اس کو مرے اشعار نے

دنیا بھر کے لٹریچر میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جب اہل قلم نے سماجی وسیاسی جبر کے خلاف ناراضی کا اظہار کیا مگر سماج کے ایک رکن ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ہمیشہ ایک ذمہ دار شہری ہونے کا ثبوت دیا، ان کی سماجی اور تخلیقی زندگی کے درمیان وحدت قائم رہی۔ لیکن اقبال ساجد کا المیہ یہ ہے کہ اس نے سوسائٹی کے ممبر کی حیثیت سے کبھی کوئی ذمہ داری قبول ہی نہیں کی، وہ بغیر محنت کیے چیزوں پر حق جتاتا ہے اور سوسائٹی کی موجودہ تنظیم میں یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی قسم کی ذمہ داری سے گریز کی راہ اختیار کرے اور سوسائٹی پھر بھی اسے مراعات سے نوازے؟ لہٰذا سوسائٹی نے اسے نکما شخص قرار دے کر رد کردیا اور وہ لمحہ لمحہ ضروریات زندگی کے لیے ترسنے لگا۔ اور نتیجتہً اسے بعض ایسے بھی کام کرنے پڑے جنھیں مروجہ معاشرت اور اخلاق کی نظر میں پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب معاشرے کی طرف سے اسے نظر انداز کرنے کا روّیہ سامنے آیا تو اس کی انا کو زبردست ٹھیس لگی اور اس نے ردعمل کے طور اس سسٹم کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی شخصیات کو بھی رد کرنا شروع کردیا۔

فراقؔ و فیضؔ و ندیمؔ و فرازؔ کچھ بھی نہیں
نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں

اسے اپنے نظر انداز کیے جانے کا شدید صدمہ ہوا ردعمل کے طور پر اُس نے ان لوگوں کے خلاف بھی ناراض خوئی کا اظہار کیا جو درحقیقت اُس کے محسن تھے۔

اقبال ساجد کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے ہاں انانیت اور شاعرانہ تعلّی اس قدر زیادہ کیوں ہے؟ یقیناً اس نفسیاتی کی وجہ ناقدری کا شدید احساس ہی ہے۔ جب لوگوں کی طرف سے اسے بڑا شاعر ماننے سے انکار کیا گیا تو اُس نے خود یہ "فریضہ" انجام

دینا شروع کردیا۔

عہدِ جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟
گر میں نہیں تو اور یہاں زندہ کون ہے؟

☆

زمانہ کہہ رہا ہے جب خدائے شاعری تجھ کو
ترے چہرے پہ بجتا ہے جلال و جاہ کا رہنا

☆

لکھنے میں ادا فرضِ تعلّی بھی ہو ساجد
دنیائے ادب میں تر ا سکّہ ہے رواں لکھ

☆

سماجی زندگی میں ناکامی کے بعد اسے بہت سی ذہنی اور جسمانی بیماریوں نے گھیر لیا باہر سے تو شکست ہو چکی تھی اب اُس نے اندر سے بھی ہار مان لی اور سوسائٹی اور غیر تخلیقی لوگوں کی طرف سے ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ وہ اپنی ہی ذات سے لینے لگا۔ چنانچہ بیگانگی، شراب نوشی، چھوٹی موٹی چوریاں، دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا، جھوٹ بولنا، دوسروں کی توہین کرنا ان سب روّیوں کی آڑ میں دراصل وہ اپنی ہی ذات سے انتقام لے رہا تھا۔ اس کی ناراض خوئی کا تیسرا رُخ اس کی اپنی ہی ذات کی طرف مُڑ گیا اور وہ ہر بات کا بدلہ اپنی ذات سے لینے لگا۔

میں خود سے لڑائی میں ہوں معروف شب و روز
کیا جانیے کیوں ختم تصادم نہیں کرتا؟

وہ ساجد جو کبھی دوسروں کو چھاؤں بخش کر خود دھوپ میں جلنے کی بات کرتا تھا اب دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوش ہونے لگا۔

اپنی انا کی آج بھی تسکین ہم نے کی
جی بھر کے اُس کے حُسن کی توہین ہم نے کی
لہجے کی تیز دھار سے زخمی کیا اسے
پیوست دل میں لفظ کی سنگین ہم نے

تسکین کی ایک صورت تو دوسروں کو اذیت پہنچانے کے حوالے سے سامنے آتی ہے جبکہ دوسری صورت ایذا طلبی ہے۔ بقول اقبال ساجد

دہائی دوں کہ کُھلے ظلم سے بچائے مجھے
کوئی تو ہو مرے پنجے سے جو چھڑائے مجھے
مرے ہی منہ کو میرا خون لگ چکا ہے یہاں
مرے سوا کوئی قاتل نظر نہ آئے مجھے
میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغل اذیت پسند آئے مجھے

آخری عمر میں مایوسیوں، محرومیوں اور بیماریوں نے اس کے نحیف جسم میں پنجے گاڑ دیے تھے اور وہ کچھوے کی طرح گردن اندر سمیٹنے لگا تھا۔ وہ شاعر جو سسٹم سے اُلجھتا تھا اب خارجی قوتوں سے برسرِ پیکار ہونے کی بجائے اپنی ذات کے اندر پناہ ڈھونڈنے لگا۔

مُوند کر آنکھیں تلاش بحر و بر کرنے لگے
لوگ اپنی ذات کے اندر سفر کرنے لگے

ذات کی محرومیوں، ناکامیوں اور سوسائٹی کی طرف سے روکیے جانے کے باعث وہ اپنے "اندر" اُترنے لگا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ دیگر عوارض کے ساتھ ساتھ شدید قسم کے احساسِ تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ہی گھر میں قیدِ تنہائی کاٹنے لگا ہے۔

گھٹیا قسم کی شراب نوشی اور مختلف قسم کی ذہنی و جسمانی بیماریوں کے ردِعمل کے نتیجے میں اس نے اپنے لیے جس زندگی کا انتخاب کیا وہ سراسر خودکشی کے مترادف تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بنیادی طور پر بزدل تھا ایک ہی وار میں خود کو ختم کر لینے کی بجائے وہ قسطوں کی صورت موت کو گلے لگاتا رہا۔ آخری عمر کے اشعار اس کی تائید کرتے ہیں۔

کیا سوچتا ہے کاٹ رگ و پے کی رسیاں
اب خون کا عذاب بدن سے نکال دے

☆

چلۂ جاں پر چڑھا کر آخری سانسوں کے تیر
موت کی سرحد میں داخل زندگانی ہوگئی

☆

میں آدھے جسم سے زندہ ہوں یہ بھی کیا کم ہے؟
الٰہی اور اضافہ نہ کر تباہی میں !!!
کس نے اپنے ہاتھ سے خود موت کا کتبہ لکھا
کون اپنی قبر پر عبرت کا پتھر ہوگیا

☆

چنانچہ اقبال ساجد کی وہ ناراض خوئی اور احتجاج جو ایک ظالمانہ سسٹم اور استحصالی طبقوں اور قوتوں کے خلاف شروع ہوا تھا بالآخر اس کی اپنی ذات اس کا شکار ہوگئی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ نظام کے مقابلے میں اس کی ذات بہت کمزور ہے اس لیے ردعمل کے طور پر وہ ہر چیز سے انکاری ہوگیا اور اس نے اپنے سامنے آنے والی، ہر شے کو رد کردیا۔ سسٹم، ادارے، شخصیات حتیٰ کہ اپنی ذات کی بھی نفی کردی ہے۔ اس نے مرّوجہ اخلاقیات کو بھی رد کردیا اور نئی اخلاقیات کے اجراء کی اس کے دل میں کوئی آرزو نہ تھی لہٰذا اس نے چوری، جھوٹ اور نشے کے علاوہ ہر وہ کام کیا جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچائی جاسکتی تھی۔ اُس نے ایک ظالمانہ سسٹم کو رد کردیا مگر دوسرا سسٹم دینے کی کوشش نہیں کی کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی اصلاح پسندی ہے اور وہ اصلاح پسندی کی بجائے مکمل انقلاب کا حامی تھا۔

اگر ہم فنی سطح پر اقبال ساجد کی ناراض خوئی کا تجزیہ کریں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس کی ناراضی ایک ایسے بچے کی ناراضی ہے جو محنت کیے بغیر محض اس بات پر لڑتا ہے کہ اسے دوسروں سے کم حصہ ملا ہے۔ وہ سسٹم کے خلاف اپنی نارض خُوئی کو کائناتی بنانے کی بجائے شخصیات بلکہ ذاتیات پر اُتر آیا۔ اور بالآخر اس کی اپنی ذات بھی اسی ناراض خوئی کی نذر ہوگئی۔

اس کا احتجاج اکہری سطح کا ہے۔ جس میں زبان وبیان کے اعتبار سے بھی ایک سے زیادہ شیڈز، سطحیں اور جہتیں نظر نہیں آتیں؟ کیونکہ زمانے سے جنگ کے ساتھ ساتھ فنکار کو ایک جنگ اپنی ذات کے خلاف بھی لڑنی پڑتی ہے اور اس تصادم کو ذاتی تجربے کے حوالے سے ایک خاص تہہ داری، گہرائی اور فنکاری سے پیش کرنا ہی کمالِ فن ہے۔

منتخب کلام

غزل

غار سے سنگ ہٹایا تو وہ خالی نکلا
کسی قیدی کا نہ کردار مثالی نکلا

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

سب کی آنکھوں میں تری شکل نظر آئی مجھے
قرعۂ فال مرے نام پہ گالی نکلا

راس آئے مجھے مرجھائے ہوئے زرد گلاب
غم کا پَر تو مرے چہرے کی بحالی نکلا

کٹ گیا جسم مرے سائے تو محفوظ رہے
میرا شیرازہ بکھر کر بھی مثالی نکلا

رات جب گزری تو پھر صبح حنا رنگ ہوئی
آسماں جاگی ہوئی رات کی لالی نکلا

رات مجھ سے بھی تو ہر گھر کے در و بام بچے
کوئی بھی گھر نہ یہاں سانپ سے خالی نکلا

تخت خالی ہی رہا دل کا ہمیشہ ساجدؔ
اس ریاست کا تو کوئی بھی نہ والی نکلا

غزل

جب ہوئی رائے شماری سبھی صادق ٹھہرے
ایک ہم تھے کہ جو بستی میں منافق ٹھہرے

آج کے دن بھی مرا رزق نہ مجھ پہ اُترا
آج کے دن بھی پڑوسی مرے رزاق ٹھہرے

شہر کے باغ میں ہوجائے ملاقات تو پھر
کون گلیوں میں رُکے، کون پس چق ٹھہرے

کوئی چاہے کہ نہ چاہے نہیں پرواہ ان کو
خود ہی معشوق ہوئے، خود ہی وہ عاشق ٹھہرے

خواہشِ الفت وشفقت سے ہوئے ہیں محروم
ان یتیموں کے لیے کوئی تو مُشفق ٹھہرے

نہ کوئی دین تھا اُس کا، نہ کوئی مذہب تھا
دلِ مُردہ کے لواحق ، نہ لواحق ٹھہرے

گردشِ خوں پہ ہے جب گردشِ دوراں کا اثر
کیوں نہ ساجد تنِ لاغر میں تپ دق ٹھہرے

غزل

دہر کے اندھے کنویں میں کس کے آوازہ لگا
کوئی پتھر پھینک کے پانی کا اندازہ لگا

ذہن میں سوچوں کا سورج برف کی صورت نہ رکھ
گھر کے دیوار و دَر پہ برف کا غازہ لگا

رات بھی اب جا رہی ہے اپنی منزل کی طرف
کس کی ذھن میں جاگتا ہے گھر کا دروازہ لگا

کانچ کے برتن میں جیسے سُرخ کاغذ کا گلاب
وہ مجھے اتنا ہی اچھا اور تروتازہ لگا

پیار کرنے بھی نہ پایا تھا کہ رُسوائی ملی
جُرم سے پہلے ہی مجھ کو سنگِ خمیازہ لگا

شہر کی سڑکوں پہ اندھی رات کے پچھلے پہر
میرا ہی سایہ مجھے رنگوں کا شیرازہ لگا

جانے رہتا ہے کہاں اقبال ساجد آج کل
رات دن رہتا ہے اس کے گھر کا دروازہ لگا

غزل

ہسپتالوں میں یہ کاروبار بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خوں کا بیوپار بھی کرنا پڑا

مستحق لوگوں میں بھی بانٹے ہیں ہیرے خون کے
کچھ مریضوں کے لیے ایثار بھی کرنا پڑا

چلتے پھرتے تھیٹروں میں ایک جوکر کی طرح
ہنسنے رونے کا مجھے کردار بھی کرنا پڑا

میں نے لوگو اپنی سوچوں کی سمگلنگ آپ کی
جرم جب عائد ہوا انکار بھی کرنا پڑا

اپنی غزلوں کے تراشے جسم پہ چپکا لیے
مشتہر خود کو سرِ بازار بھی کرنا پڑا

چائے کی پیالی پہ، ہاں میں ہاں ملانا پڑ گئی
دوستوں میں خود کو برخوردار بھی کرنا پڑا

کیا کروں پتھر کو انجکشن لگانا پڑ گئے
وہ کہ بے حس تھا اسے بیدار بھی کرنا پڑا

اک طرف حالات سے اور اک طرف دشمن کیساتھ
خود کو لڑنے کے لیے تیار بھی کرنا پڑا

ہائے جس دشمن نے پہنایا مجھے طوقِ شکست
اُس کو سینے سے لگا کر پیار بھی کرنا پڑا

غزل

ہر کسی کو کب بھلا یوں مسترد کرتا ہوں میں
تُو ہے خوش قسمت اگر تجھ سے حسد کرتا ہوں میں

بُغض بھی سینے میں رکھتا ہوں امانت کی طرح
نفرتیں کرنے پہ آجاؤں تو حد کرتا ہوں میں

کوئی اپنے آپ کو منوانے والا بھی تو ہو
ماننے میں کب کسی کے رد وکد کرتا ہوں میں!

کچھ شعوری سطح پر ، کچھ لاشعوری طور پر
کارِ فکر وفن میں اب سب کی مدد کرتا ہوں میں

اس لیے مجھ سے خفا ہیں اہلِ گلشن آج کل
رنگ جُھٹلا تا ہوں ، خوشبو مسترد کرتا ہوں میں

میرے جذبوں سے بچاؤ نیک دل لوگو مجھے!
روز و شب ان بدمعاشوں کی مدد کرتا ہوں میں

دوسروں کے واسطے لکھا ہوا لگتا ہے جُھوٹ
اپنی سچائی کو اکثر آپ رد کرتا ہوں میں

رنگ پہ آئی ہوئی ہے اب جنوں خیزی مری!
روز و شب توہینِ اربابِ خرد کرتا ہوں میں

طوقِ گردن میں پہنتا ہوں لہو کی دھار کا
خلق کو حیران ساجدؔ زد بہ زد کرتا ہوں میں

غزل

سائے کی طرح بڑھ نہ کبھی قد سے زیادہ
تھک جائے گا بھاگے گا اگر حد سے زیادہ

ممکن ہے ترے ہاتھ سے مٹ جائیں لکیریں
امید نہ رکھ گوہر مقصد سے زیادہ

لگ جائے تجھی پر نہ ترے قتل کا الزام
بدنام تو ہوتا ہے بُرا، بد سے زیادہ

خواہش ہے بڑائی کی تو اندر سے بڑا بن
کر ذہن کی بھی نشو ونما قد سے زیادہ

دیکھوں تو مرے جسم پہ شاخیں ہیں نہ پتے
سوچوں تو گھنا چھاؤں میں برگد سے زیادہ

رہنے دو خلاؤں میں مری قبر نہ کھودو!
ہے پیار مجھے خاک کی مسند سے زیادہ

آنکھیں تو لگی رہتی ہیں دروازے پہ لیکن
ہوتی ہے خوشی اپنی ہی آمد سے زیادہ

کیا جانیے کیا بات ہے ایک عمر سے ساجد
ویران ہے ٹوٹے ہوئے مرقد سے زیادہ

غزل

رخِ روشن کا روشن ایک پہلو بھی نہیں نکلا
جسے میں چاند سمجھا تھا وہ جگنو بھی نہیں نکلا
وہ تیرا دوست جو پھولوں کو پتھرانے کا عادی تھا
کچھ اُس سے شعبدہ بازی میں کم تُو بھی نہیں نکلا
ابھی کس مُنہ سے میں دعویٰ کروں شاداب ہونے کا؟
ابھی ترشے ہوئے شانے پہ بازو بھی نہیں نکلا
گھروں سے کس لیے یہ بھیڑ سڑکوں پہ نکل آئی ؟
ابھی تو بانٹنے وہ شخص خوشبو بھی نہیں نکلا
شکاری آئے تھے دل میں شکار آرزو کرنے
مگر اس دشت میں تو ایک آہو بھی نہیں نکلا
تری بھی حُسن کاری کے ہزاروں لوگ ہیں قائل
گلی کوچوں سے لیکن اُس کا جادُو بھی نہیں نکلا
بتا اِس دَور میں اقبال ساجد کون نکلے گا؟
صداقت کا علم لے کر اگر تُو بھی نہیں نکلا؟

غزل

دُنیا نے زر کے واسطے کیا کچھ نہیں کیا؟
اور ہم نے شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا

غُربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی
کیسے کہیں کہ اُس نے عطا کچھ نہیں کیا

چُپ چاپ گھر کے صحن میں فاقے بچھا دیے
روزی رساں سے ہم نے گِلا کچھ نہیں کیا

پچھلے برس بھی بوئی تھیں لفظوں کی کھیتیاں
اب کے برس بھی اِس کے سوا کچھ نہیں کیا

غربت کی تیز آگ پہ اکثر پکائی بھوک
خوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا؟

دُنیا کو جانتے تھے کہ دل کی غریب تھی
اس سے طلب سُخن کا صلہ کچھ نہیں کیا

بستی میں خاک اڑائی ، نہ صحرا میں ہم گئے
کچھ دن سے ہم نے خلقِ خدا کچھ نہیں کیا

مانگی نہیں کسی سے بھی ہمدردیوں کی بھیک
ساجد کبھی خلافِ انا کچھ نہیں کیا

غزل

کل شب دلِ آوارہ کو سینے سے نکالا
یہ آخری کافر بھی مدینے سے نکالا

یہ فوج نکلتی تھی کہاں خانۂ دل سے
یادوں کو نہایت ہی قرینے سے نکالا

میں خون بہا کر بھی ہوا باغ میں رُسوا
اُس گُل نے مگر کام پسینے سے نکالا

ٹھہرے ہیں زر و سیم کے حق دار تماشائی
اور مارِ سیہ ہم نے دفینے سے نکالا

یہ سوچ کے ساحل پہ سفر ختم نہ ہو جائے
باہر نہ کبھی پاؤں سفینے سے نکالا

غزل

دہائی دوں کہ کھلے ظلم سے بچائے مجھے
کوئی نہیں مرے پنجے سے جو چھڑائے مجھے

مرے ہی منہ کو مرا خون لگ چکا ہے یہاں
مرے سوا کوئی قاتل نظر نہ آئے مجھے

کوئی گلاب بھی مارے تو مشتعل ہوجاؤں
کہ رنگ و نور کی بارش بھی اب جلائے مجھے

میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغلِ اذیت پسند آئے مجھے

میں اشتہار لگاؤں بدن پہ غزلوں کے
وہ چاہتا ہے کہ شو کیس میں سجائے مجھے

میں خود بھی اپنے اشاروں پہ آج تک نہ چلا
وہ اُنگلیوں پہ بھلا کس طرح نچائے مجھے

کٹاؤں سر کو نہ بیچوں قلم کی حُرمت کو
عزیز جاں سے زیادہ ہے اپنی رائے مجھے

مزا تو جب ہے شعاعیں بھی چھتریاں بن جائیں
خود آفتاب چلے لے کے سائے سائے مجھے

قیام کرتی ہے ساجد نئی نئی خواہش
اُجاڑ لگتی ہے دل کی مگر سرائے مجھے

غزل

اک طبیعت تھی سو وہ بھی لاأبالی ہوگئی
ہائے یہ تصویر بھی رنگوں سے خالی ہوگی

آنکھ جب برسی تو سارا جسم تازہ ہوگیا
پہلی بارش ہی غائب خشک سالی ہوگئی

باغ کا سب بڑا جو پیڑ تھا، وہ جھک گیا
پھل لگے اتنے کہ بوجھل ڈالی ہوگئی

جو مرے چہرے پہ لکھا تھا، وہ سب نے پڑھ لیا
حرف کاسہ بن گئے ، صورت سوالی ہوگئی

پڑھتے پڑھتے تھک گئے سب لوگ تحریریں مری
لکھتے لکھتے شہر کی دیوار کالی ہوگئی

کھل گئی مٹھی تو مرا ہاتھی خالی رہ گیا
مجھ میں جو روشن تھا اس کی شکل کالی ہوگئی

اب تو دروازے سے اپنے نام کی تختی اُتار
لفظ ننگے ہوگئے ، شہرت بھی گالی ہوگئی

اتنی تصویریں جلیں ، سینے کے آتشدان میں
گھر کے روشندان کی لکڑی بھی کالی ہوگئی

صبح کو دیکھا تو ساجد دل کے اندر کچھ نہ تھا
یاد کی بستی بھی راتوں رات خالی ہوگئی

غزل

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو، ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں
دکھاوے کے لیے خوشحالیاں لکھتے ہیں کاغذ پر
ہم اس دھرتی پہ ورنہ رزق کے چکّر میں رہتے ہیں
ضرورت ہی لیے پھرتی ہے ہم کو دربدر ورنہ
ہم اُن میں سے نہیں جو جستجوئے زر میں رہتے ہیں
لہو سے جو اٹھائی تھیں وہ بنیادیں نہیں اپنی
یہی محسوس ہوتا ہے پرائے گھر میں رہتے ہیں
کبھی بیداریاں قسمت تھی، اب نیندیں مقدر ہیں
ہمارا کیا ہے ہم تو شہرِ خواب آور میں رہتے ہیں
مزاج جانے گا مُجھ کو بھی سنگِ راہ بننے کا
ترے جیسے تو میرے پاؤں کی ٹھوکر میں رہتے ہیں
وہ خوشبو دار چہرے جو نگاہ و دل کا مرکز تھے
خدا جانے بچھڑ کر ہم سے کس محور میں رہتے ہیں
دکھوں کے باغ میں ہر وقت شاخِ زخم کھلتی ہے
ازل سے یہ شجر، کربِ ثمر آور میں رہتے ہیں
کوئی شہکار فنِ تکمیل کا دعویٰ نہیں کرتا
اُدھورے پن کے دکھ ساجد ہر اک پیکر میں رہتے ہیں

غزل

نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں
فراقؔ و فیضؔ و ندیمؔ و فرازؔ کچھ بھی نہیں

نہ ان کا لہجہ نیا ہے نہ ان کی سوچ نئی
یہ فکر گر، نظریہ طراز کچھ بھی نہیں

لکھیں اصول مگر اپنی منفعت کے لیے
کھلا یہ راز کہ یہ نعرہ باز کچھ بھی نہیں

غزل لکھے جو فقط اس لیے کہ گائی جائے
مری نظر میں تو وہ شعر ساز کچھ بھی نہیں

پرانے ناموں کے بوسیدہ اشتہاروں کا
فصیلِ مُلکِ سخن پر جواز کچھ بھی نہیں!

وہ لوگ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں
ہمیں جو کہتے ہیں، جدّت طراز کچھ بھی نہیں

ہے نسلِ نو سے خدا واسطے کا بیر انہیں
وگرنہ بغض و حسد کا جواز کچھ بھی نہیں

ہے اتحاد کا موسم جدیدیو اُٹھو!!!
لگاؤ نعرہ، قدامت نواز کچھ بھی نہیں

مشینی دور میں کیا قصّۂ لب و رُخسار
شکایتِ شبِ زلفِ دراز کچھ بھی نہیں

غزل

کیا ملا اقبال ساجدؔ ندرت ، فن بیچ کر
اب گزر اوقات کر دانتوں کا منجن بیچ کر

کھول لے بازار میں چہرے سجانے کی دکاں
وقت ہے پیسہ کمالے رنگ و روغن بیچ کر

تُو نے جو لکھا ہے اسکو کوڑا کرکٹ ہی سمجھ
پیٹ کا دوزخ بُجھا سوچوں کا ایندھن بیچ کر

میں کوئی یوسف نہیں کہ لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں
کچھ نہ پائے گا مجھے اے میرے دشمن بیچ کر

مُفت میں تیرے دُکھوں کا کون گاہک بن گیا؟
کس کے ہاتھوں تُو چلا آیا ہے الجھن بیچ کر

دوسروں کو اپنی ویرانی کا کیوں الزام دُوں ؟
آپ ہی صحرا خرید اُس نے گلشن بیچ کر

میرا پیرا ہن چھین کر، لوگ شہرت پا گئے
میں تو ننگا ہوگیا ، اپنا نیا پن بیچ کر

عزتیں اُن کو ملیں جن کی کوئی عزت نہ تھی
ہم کہ رُسوائی کا باعث ہوگئے فن بیچ کر

ناقدین کی آراء

عطاء الحق قاسمی

اقبال ساجد کا شمار ہمارے عہد کے اہم ترین غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ خدا جانے اقبال ساجد کے ذکر کے بعد میرے ذہن میں یگانہ چنگیزی کا نام کیوں آتا ہے؟ شاید اس لیے کہ دونوں میں انانیت بڑی تھی اور دونوں اپنے بلند بانگ ادبی دعوؤں کی وجہ سے اس مقام سے بھی محروم رہے جوان کا حق تھا۔ اقبال ساجد کے ساتھ ایک بدقسمتی یہ بھی تھی کہ اس نے تمام عمر شاعری کے علاوہ کچھ نہیں کیا حتیٰ کہ کبھی ڈھنگ کی گفتگو بھی نہیں کی۔ وہ اپنی شاعری میں جن خوبصورت خیالوں میں گمن نظر آتا ہے ان کا پرتو کبھی اس کی شخصیت سے ظاہر نہیں ہوا۔ چنانچہ مجھے آج تک سمجھ نہیں آسکی کہ وہ اتنی اعلیٰ درجے کی شاعری کیسے کرتا تھا۔ شاید اس لیے اہل یونان شاعری کو دیوتاؤں کا انعام سمجھتے تھے۔

جواز جعفری ہم سب کے دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے بے نوا لیکن باکمال شاعر کا کلام شب و روز محنت کے نتیجے میں یکجا کیا جسے میرے نزدیک نقادوں کے تمام گروہوں نے مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ ان حالات میں ساجد کی کلیات کا مرتب کر کے شائع کرنا، جواز جعفری کی طرف سے ایک ادبی خوشخبری کی ذیل میں آتا ہے۔

سلیم شاهد

یاس یگانہ چنگیزی اردو شاعری میں اسلوب اور مزاج کے اعتبار سے یکتا اور بیگانہ شاعر گزرے

ہیں۔ غالبؔ جیسے استاد شاعر سے ''آدھا'' لگا کر شاعری کی اور جب صلح کے بارے میں سوچا تو یہ کہا۔

صلح کر لو یگانہؔ ، غالبؔ سے
تم بھی استاد وہ اک استاد

یہاں بھی غالب کو محض اک استاد کہہ کر اپنے شعری منصب کو بلند رکھا۔ ہمارے عہد میں بھی اقبال ساجد یگانہ کے مزاج کا شاعر تھا۔ میر، غالب یا اقبال سے تو اس نے آدھا نہیں لگایا۔ مگر اپنے سینئر معاصرین سے خوب محاذ آرائی کی۔

نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں
فراقؔ و فیضؔ، ندیم و فرازؔ کچھ بھی نہیں

بنیادی طور پر ناراض خُو شاعر تھے۔ اس کے بے شمار وجوہات ہوسکتی ہیں مگر بنیادی وجہ ہمارے ہاں کی ادبی بددیانتی ہے۔

سن 50 کی دہائی کے آخری سالوں میں شاعری کا آغاز کیا۔

ابتداء مشاعروں کی ادبی رسائل میں بکثرت شائع ہوا۔ ہر لحاظ سے پختہ کار اور صاحب اسلوب شاعر تھا۔ اپنے گردو پیش لکھنے والے شعراء کو سوائے محدود چند سب کو تاہ قد، بونے چھوٹے لوگ کہتا تھا اور منہ پر بات کہنے میں بالکل جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔ اقبال ساجدؔ کے ساتھ واقعہ یہ ہوا۔ جب وہ شعری ماحول میں داخل ہوا تو ادبی گروہ بندی اپنے عروج پر تھی۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے ساتھ رائٹرز گلڈ بھی بنی اور ادب اور ادیبوں کی خرید و فروخت کا کام بھی شروع ہوا تو کرشاہی براہ راست ادبی سیاست میں ملوث ہوگئی۔ لالچ اور دوشام طرازی دونوں ہی اقتدار اعلیٰ کے ایما پر دیا جارہا تھا۔ جو تحریریں داد و تحسین کی مستحق تھیں ان کو نظر انداز کیا جارہا تھا اور فضول اور ہلکی تخلیقات کو انعام و اکرام سے نوازا جارہا تھا۔ پاکستان میں ادب کا یہ کاروبار نیا نیا شروع ہوا تھا۔ سویرا، ادب لطیف، لیل و نہار، امروز میں ڈنڈی مارنے کا رجحان آرہا تھا۔ اس فضا میں اقبال

ساجد نے شاعری کا آغاز کیا۔ جب وہ نجی محفلوں میں شعر سناتا تو خوب داد حاصل کرتا مگر جہاں ادب شعر سے منفعت کا معاملہ ہوتا یکسر نظر انداز کیا جاتا۔ اس منافقت نے اقبال ساجد کو ناراض ئو شاعر بنا دیا۔ بہرحال یہ اقبال ساجد کی اصول پرستی اور بہادری تھی کہ وہ آخری وقت تک ان ادیبوں اور شاعروں سے نبرد آزما رہا جو اوسط درجے کے شاعر اور ادیب تھے۔ اقبال ساجد کی زندگی کا یہ اہم پہلو تھا۔ دوسرا اہم حصہ وہ ہے جو اس کی شاعری میں موضوع بن کر ابھرا ہے۔ اقبال ساجد کی شاعری ہمارے سماجی اور سیاسی منظر نامہ کا ایک آئینہ ہے۔ ہمارے اردگرد جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے۔ وہ سب کچھ اقبال ساجد نے موضوعِ سخن بنایا چونکہ وہ ایک پختہ کار شاعر تھا لہٰذا کئی جگہ پر اس کے اشعار ہماری تاریخ کا حوالہ بن گئے۔

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

اسرار زیدی

گذشتہ ربع صدی میں نئی غزل کے رنگ و روپ سنوارنے کے ضمن میں جن شعراء کے نام نمایاں ہیں ان میں شکیب جلالی اور اقبال ساجد کو کسی حوالے سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مطالعہ کی کمی کے باوجود اقبال ساجد نے غزل میں جو تجربے کئے اور اس کو جس نئی لفظیات سے ہم آہنگ کیا وہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اقبال ساجد واقعتاً فطری شاعر تھا۔ روایت کا سنگین بت اور مروجہ زبان کے سنگلاخ راستے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کے لیے رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس کی غزل فنی اور عصری صداقتوں کی آئینہ دار ہے۔ تخلیقی سطح پر یہ اعزاز نئی غزل کے بہت کم شعراء کو نصیب ہوا۔

شاهد واسطی

اقبال ساجد کے تخلیقی عمل نے اردو غزل کے دھنک رنگ شیش محل میں شمعیں روشن کی

ہیں۔سماجی شعور کی یہ روشن آواز توانا ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اردو غزل میں منفرد اضافہ بھی ہے یہ تازہ اسلوب آوازوں کے گھنے جنگلات میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔اقبال ساجد کی چونکا دینے والی شاعری جو قلب وگوش میں اترتی چلی جاتی ہے۔دراصل فن کاری کا خداداد کارنامہ ہے۔

احمد ندیم قاسمی

اقبال ساجد نے اس حیرت انگیز قادر کلامی سے انتہا درجہ کی تلخی کو فن بنایا ہے اور فن بھی غضب کا اس سے یگانہ اور شاد عارفی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اسے دعوٰی بھی تھا اور حقیقت بھی ہے کہ وہ دور جدید کا نمائندہ شاعر تھا۔

احمد ندیم قاسمی

اقبال ساجدؔ جدید غزل کو کہلانے پر بضد رہتا تھا اور اپنے سے زیادہ عمر کے شعراء کی شاعری کو دور جدید کے تقاضوں کے حوالے سے غیر ضروری بلکہ بے معنی قرار دیتا تھا۔دوسری بات کی صحت پر بات ہوسکتی ہے مگر جہاں تک خود اپنے بارے میں اقبال ساجدؔ کے ادّعا کا تعلق ہے، وہ کم بیش صداقت پر ہی مبنی تھا۔اس کی غزل کے موضوعات، اس کی منفرد لفظیات، اور اس کا خاص اپنا لہجہ اس کے ثبوت ہیں۔بے شک اس کے کلام میں جارحیت اور تلخی کے عناصر زیادہ ہیں مگر یہ عناصر غزل کے ممنوع نہیں ہیں۔آخر یگانہؔ اور شادؔ عارف کا کلام بھی تو اسی تلخی نوائی کا عکاس ہے مگر کسی جرأت ہے کہ انہیں بیسویں صدی کے سربرآوردہ غزل گو شعراء کی صف میں سے خارج کرے۔ اقبال ساجدؔ کی غزل نے نہایت ذہین نوجوان غزل گو شعراء کے ہجوم میں اپنی الگ پہچان کو تسلیم کرالیا تھا اور اس کا سب سے سچا گواہ اس کا کلام ہے۔

جوازؔ جعفری ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے اقبال ساجدؔ کے کلام کو یکجا کر کے ضائع ہونے سے بچالیا۔

منیر نیازی

اقبال ساجد جدید اردو غزل کے شعراء میں ایک اہم نام ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کی معاشی اور معاشرتی ابتری کا اثر ایک حساس شاعر پر کس طرح اور کس انداز سے ہوتا ہے، اقبال ساجد کا کلام اس کی دردناک مثال ہے۔ اپنے آپ پر طنز، اس ماحول میں گندی سیاست سے بڑے بنے ہوئے اہلِ دانش و شعر پر زہر میں بجھے ہوئے اشعار کی معرفت غم و غصے کا اظہار، کہیں کہیں خود رحمی، کہیں کہیں زخمی انا کی مدافعت، کبھی کبھی خود کو غلط کثرت سے سمجھوتہ کر لینے کی تلقین۔ یہی اقبال ساجد کی شاعری کا حاصل ہے۔ یعنی ایک بگڑے ہوئے نظامِ حیات میں شرفِ انسانی کی بقا کی شاعرانہ خواہش کا بیان۔

اقبال ساجد کے کلام کو یکجا کرنے اور اسے ہمعصر دنیا میں اہمیت دلانے میں ہمارے دوست جواز جعفری نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ جواز جعفری نہ ہوتے تو اس اہم شاعر کا بہت سا کلام اور شخصیت کے بہت سے گوشے ادب پڑھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہ جاتے۔

شہزاد احمد

-----ساجد کی غزل، جدید غزل سے پوری طرح مربوط ہوتے ہوئے بھی اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔ کاش اقبال ساجد کو اتنا وقت مل جاتا کہ وہ اسے اور وسعت دے سکتا۔ اس کے کلام کا کچھ حصہ بُری طرح بکھرا ہوا ہے۔ کچھ تو ایسا بھی ہے جو دوسروں کے نام پر پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ جواز جعفری مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اقبال ساجد کے مجموعے "اثاثہ" کے بعد ورق اکٹھا کر کے ان کی کلیات شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اقبال ساجد کی پہچان اس حد تک مکمل ہو جائے گی جتنی کہ موجودہ حالات میں ممکن ہے۔

حوالہ جات و کتابیات

1۔ اقبال ساجد نے ''ماہنامہ فنون'' لاہور، کے جدید غزل نمبر میں صفحہ نمبر 1664 پر اپنے مختصر حالات زندگی لکھتے ہوئے یہی تاریخ پیدائش لکھی ہے۔ جبکہ اس کے شناختی کارڈ پر 1940ء درج ہے۔

2۔ یہ بات بیگم اقبال ساجد نے راقم کو 12 مئی 1989 کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

3۔ یہ بات بیگم اقبال ساجد نے راقم کو 12 مئی 1989 کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

4۔ یقیناً بیگم ساجد کا اشارہ وحید دہلوی کی طرف ہے جو اقبال ساجد اور بیدل حیدری کے استاد تھے۔

5۔ یہ بات بیگم اقبال ساجد نے راقم کو 12 مئی 1989ء کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

6۔ ماہنامہ ''فنون'' جدید غزل نمبر۔۔۔ مدیر، احمد ندیم قاسمی۔۔۔ جنوری 1969ء ص 1664۔

7۔ یہ بات راقم کو بیگم اقبال ساجد نے ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

8۔ ایضاً

9۔ یہ بات بیگم اقبال ساجد نے 12 مئی 1989 کو راقم کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

10۔ منو بھائی: ''گریبان'' روزنامہ جنگ، لاہور، مورخہ 26 مئی 1988ء۔

11۔ راقم کو یہ بات عباس تابش نے کیم اکتوبر 1988ء کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

12۔ راقم کو یہ بات بیگم اقبال ساجد نے 12 مئی 1989ء کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

13۔ بیگم اقبال ساجد نے راقم کو یہ بات 12 مئی 1989ء کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

14۔ عطاالحق قاسمی'' روزن دیوار سے'' نوائے وقت، لاہور، مورخہ 26 مئی 1988ء۔

15۔ ڈاکٹر انور سدید'' ماہنامہ غنیمت'' لاہور، مدیر، زمان کنجاہی، ص 24، اگست 1989ء۔

16۔ پاک ٹی ہاؤس لاہور کے منیجر زاہد سراج نے راقم کو یہ بات ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

17۔ یہ بات بیگم اقبال ساجد نے راقم کو 12 مئی 1989ء کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

18۔ یہ بات پاک ٹی ہاؤس کے منیجر زاہد سراج نے راقم کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

19۔ یہ بات راقم کو شاہدہ واسطی نے یکم اکتوبر 1989ء کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

20۔ راقم کو یہ بات بیگم اقبال ساجد نے 12 مئی 1989ء کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

21۔ ڈاکٹر انور سدید، ماہنامہ ''تخلیقات'' مدیر زمان کنجاہی، ص 25,26 اگست 1989ء۔

22۔ راقم کو یہ بات اقبال ساجد کی بیگم نے ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

23۔ زاہد سراج نے راقم کو یہ بات ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

24۔ عطاالحق قاسمی ''روزن دیوار سے'' روزنامہ نوائے وقت، لاہور، مورخہ 27 مئی 1988ء۔

25۔ راقم کو یہ بات ستار طاہر مرحوم نے یکم جون 1989ء کو ایک گفتگو کے دوران بتائی۔

26۔ یہ بات احمد راہی نے راقم کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

27۔ حامد یزدانی نے یہ بات 4 ستمبر 1989ء کو ایک گفتگو کے دوران راقم کو بتائی۔

28۔ راقم کو یہ بات ستار طاہر مرحوم نے مورخہ 15 نومبر 1989ء کو ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔

29۔ عطاالحق قاسمی ''روزن دیوار سے'' روزنامہ نوائے وقت، لاہور

30۔ قدرت اللہ شہاب، ''شہاب نامہ'' سنگ میل لاہور، 1987ء بار دوئم ص 617۔

31۔ صفدر میر ''مارکس کا تصور بیگانگی'' مکتبہ دانیال لاہور، 1985ء بار دوئم ص 10-11۔

32۔ صفدر میر ''مارکس کا تصور بیگانگی'' مکتبہ دانیال لاہور، 1985ء بار دوئم۔

33۔ ڈاکٹر انور سدید کا راقم کے ساتھ مکالمہ روزنامہ امروز لاہور، 8 نومبر 1989ء۔

34۔ عارف عبدالمتین، روزنامہ جنگ، لاہور، 22 مئی 1988ء۔

35۔ احمد ندیم قاسمی، روزنامہ جنگ، لاہور، 22 مئی 1988ء۔

36۔ ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ راقم کا مکالمہ روزنامہ امروز، لاہور، 8 نومبر 1989ء۔

37۔ تحسین شفائی، روزنامہ جنگ، 22 مئی 1989ء۔